طلوع اسلام

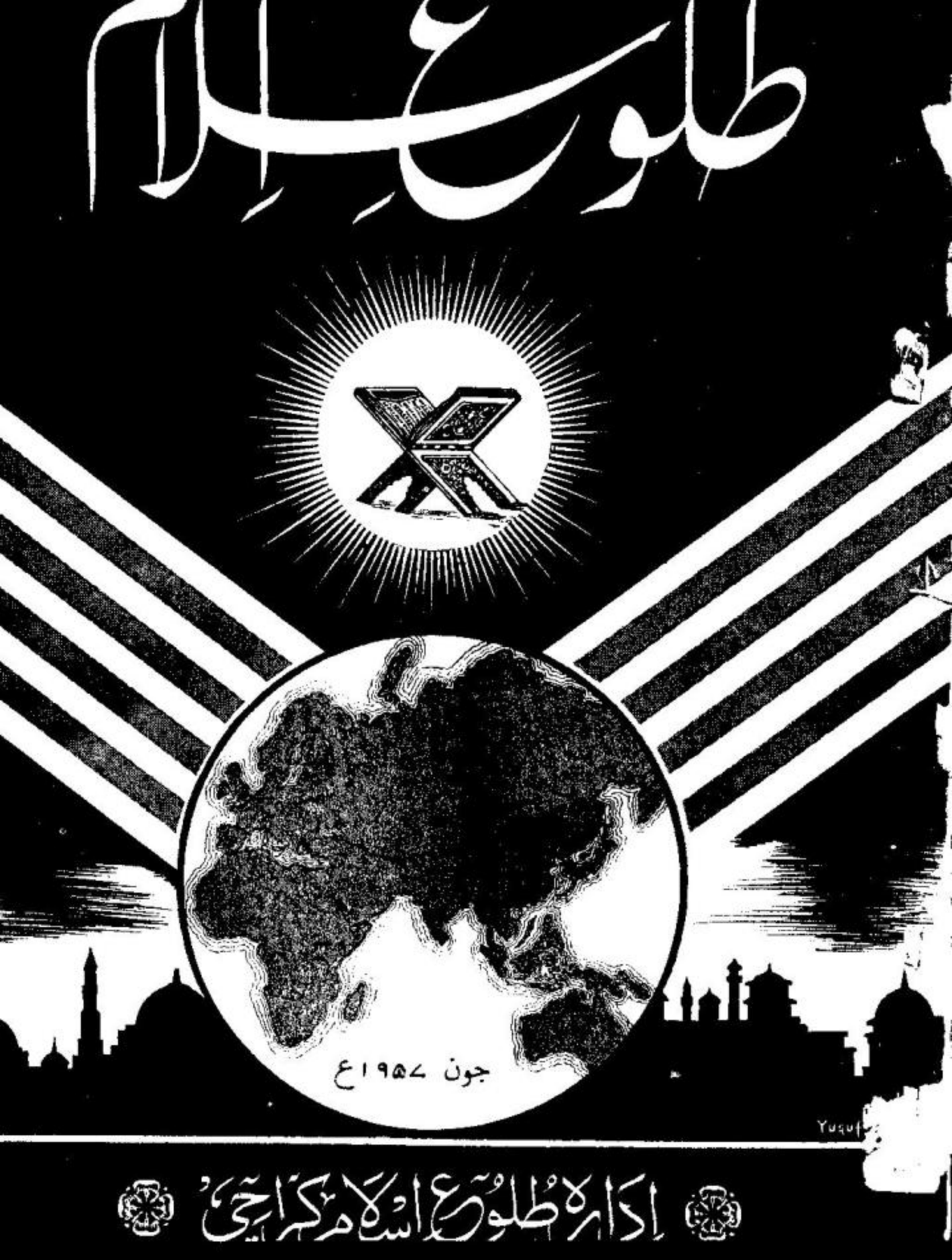

ادارہ طلوع اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون ۱۔ ۳۱۴۸۸
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ۔ آٹھ روپے غیر ممالک سے سالانہ ۱۳ شلنگ	ہندوستان اور پاکستان سے بارہ آنے	خط و کتابت کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۹/۱۳ ۱۵۹ ایل (پی۔ای۔سی) ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۲۹

جلد ۱۰ — جون ۱۹۵۷ء — نمبر ۶

فہرست مضامین

لمعات		۲ — ۸
سلیم کے نام	(محترم پرویز صاحب)	۹ — ۲۴
اردو زبان میں نماز	(محترم پرویز صاحب)	۲۵ — ۳۲
حکم قرأت بزبانِ اردو در نماز	(علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی)	۳۲ —
قرآن کے باطنی معانی		۳۳ — ۴۰
مجلس اقبال		۴۱ — ۴۸
قرآنی معاشرہ	(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)	۴۹ — ۵۶
باب المراسلات		۵۷ — ۶۹
نقد و نظر		۷۰ — ۷۲
رابطۂ باہمی	(سکریٹری مرکزی بزم طلوعِ اسلام)	۷۵ — ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۲ مئی کے نوائے وقت (لاہور) میں یہ المناک خبر شائع ہوئی ہے۔

"کوئٹہ ۱۱ مئی۔ نورالائی سے اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ایک شخص نے جامع مسجد کے نوجوان امام کو قتل کردیا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مقتول اور ملزم کے درمیان کئی روز سے یہ بحث جاری تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں تھے۔ امام مسجد کا کہنا تھا کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے اس کے برعکس ملزم کا خیال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی غیب سے واقف تھے۔

اس بحث نے بالآخر تلخ صورت اختیار کرلی اور ایک رات ملزم چھری لے کر مسجد میں آیا جہاں امام رہا کرتا تھا اور دوبارہ یہ سوال دہرایا کہ اب کیا خیال ہے رسول اللہ بھی غیب داں تھے کہ نہیں۔ امام مسجد اپنے عقیدہ پر ڈٹا رہا جس پر ملزم نے اس پر چاقو سے پے در پے وار کرکے اسکی زندگی کا خاتمہ کردیا اور بعد میں خون آلود چھری لے کر بازار میں آیا اور لوگوں کو بتایا کہ میں نے آج ایک سکھ کا کام تمام کردیا ہے۔ مقتول کے بدن پر زخموں کے انیس نشان تھے۔ ملزم کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

ہم نے اس خبر کو لاہور کے ہفتہ وار جریدہ الاعتصام (۱۷ مئی ۱۹۵۷ء) کے حوالے سے درج کیا ہے جو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"یہ واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر بھی اس قسم کے متعدد واقعات اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ مثلاً راولپنڈی کے معروف عالم مولانا غلام اللہ خاں صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اور احمد پور شرقیہ کے قریب ترمینڈہ محمد پناہ کے ایک رئیس جندو ڈاھاں کو نہایت بیدردی سے قتل کیا گیا۔

ان الم انگیز واقعات پر مغربی پاکستان کے قریب قریب تمام اخبارات نے اظہار تاسف کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کونسا

شریف انسان ہے جو اس قسم کی وحشیانہ حرکات کی مذمت نہیں کرے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مرض کی علت اور اس جنون کا اصلی سبب کیا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ان واقعات کا ذمہ دار انہی افراد کو قرار دیا جائے گا جن کے ہاتھوں ارتکاب جرم ہوا ہے۔ لیکن آپ بنظرِ غائر دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ یہ جاہل افراد درحقیقت ان مذہبی پیشواؤں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں جو انھیں مذہب کے نام پر اشتعال دلاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ عوام اپنے اپنے عقیدہ میں کتنے ہی پختہ کیوں نہ ہوں وہ دوسرے عقائد رکھنے والوں سے نفرت اور عداوت نہیں رکھتے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک مولوی صاحب کہیں سے تشریف لے آتے ہیں وہ اپنے ہم عقیدہ گروہ کو اکٹھا کر کے اس قسم کے وعظ کہنا شروع کر دیتے ہیں جس میں برملا کہا جاتا ہے کہ فلاں قسم کا عقیدہ رکھنے والے لوگ اسلام میں فتنہ برپا کر رہے ہیں۔ وہ ناموسِ رسالت کے دشمن ہیں۔ وہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس کے خلاف گستاخیاں کرتے ہیں۔ وہ بزرگانِ کرام کی توہین کرتے ہیں۔ وہ اولیاء کے عظام کی تحقیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ خدا اور رسول کے دشمن، ملحد بے دین، زندیق اور مرتد ہیں۔ اور چونکہ مرتد کی سزا اسلام میں قتل ہے اس لئے جو شخص انھیں قتل کر دے اگر زندہ رہ جائے تو غازی اور مارا جائے تو شہید ہے۔

یہ حضرات مسلسل اس قسم کی تقریریں کرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر اوقات اپنے مخالفین کے نام لے لے کر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ عوام کے جذبات بارود کے ڈھیر کی طرح ہوتے ہیں جن کے مشتعل کر دینے کے لئے ایک چھوٹی سی چنگاری کافی ہوتی ہے۔ ان مولوی صاحبان کی اس قسم کی تقریریں اور وعظ اس چنگاری کا کام دیتے ہیں جس سے عوام کے جذبات فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اس قسم کے الم انگیز واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

لہٰذا اس قسم کے وحشیانہ اقدامات کے سدباب کے لئے ان جرائم کے مرتکبین کو سزا دینے کے ساتھ ساتھ ہی اس کے لئے ضروری ہے کہ اس اشتعال انگیزی کو بھی روکا جائے جو ان دلدوزواقعات کا حقیقی موجب بنتی ہے۔ چنانچہ معاصر الاعتصام نے بھی اس ضمن میں لکھا ہے کہ

> حکومت یہ کیوں کھوج نہیں لگاتی کہ کس فرقے کے کون کون علماء کن کن لوگوں کے خلاف تیز تیز تقریریں کر رہے ہیں، اور لوگوں کے جذبات مشتعل کر رہے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے خلاف کوئی حفاظتی قانون حرکت میں نہیں آسکتا؟

لیکن جیسا کہ فرقہ پرستی کا خاصہ ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کوئی فرقہ اپنے ہاں کے اس قسم کے آتش فشاں اور اشتعال انگیز وعظوں اور مقرروں کی مذمت نہیں کرتا۔ وہ ان "مجاہدانہ کوششوں" کو اسلام کی تبلیغ اور دین کی خدمت قرار دیتا ہے۔ لیکن جب کوئی فریق مقابل کا اس قسم کا مقرر ایسی تقریریں کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں جب ان کے فرقہ کا کوئی آدمی اس کی اشتعال انگیزی کا نشانہ بن جاتا ہے تو یہ صدائے احتجاج بلند کرنے لگ جاتے ہیں۔ ماحصل اس کا یہ ہوتا ہے کہ اشتعال انگیز تقریروں کے خلاف احتجاج کی آوازیں بھی بلند ہوتی رہتی ہیں اور اس قسم کی تقریریں بھی بدستور ہوتی رہتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک

اس ذہنیت کو بدلا نہیں جاتا اس وقت تک اس تباہ کن اور ہلاکت انگیز مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کا اصل علاج تو قرآن کریم کی صحیح تعلیم کو عام کرنا ہے لیکن یہ ایک لمبا پروگرام ہے اور اشتعال انگیزی کا یہ سیلاب جس سرعت سے بڑھ رہا ہے وہ فوری تدابیر کا متقاضی ہے۔ ہمارے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) مختلف فرقوں کے سنجیدہ حضرات جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی اشتعال انگیز تقاریر اور وحشیانہ اقدامات اسلام کی تعلیم کے یکسر خلاف ہیں وہ متفقہ طور پر بیٹھیں اور ایک ایسا پروگرام تجویز کریں جس کی رو سے ہر فرقہ کے واعظ اور مقرر مذہبی اداروں اور مختلف عقائد رکھنے والے لوگوں سے حسن سلوک کی عام تبلیغ کریں اور تعصب اور مذہبی جنون کی مذمت کریں۔ تقاریر کا یہ سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیئے۔

(۲) حکومت اس کا انتظار نہ کرتی رہا کرے کہ کسی قسم کی واردات ہو جائے تو پھر اس کی قانونی مشینری حرکت میں آئے۔ اسے چاہیئے کہ ہر فرقہ کے تحریری لٹریچر کا نہایت کڑی نگاہ سے محاسبہ کرتی رہے اور اس میں جہاں جہاں کوئی اشتعال انگیز بات نظر آئے اس پر فوراً گرفت کرے۔ نیز مختلف فرقوں کے اجتماعات میں ان کے ذمہ دار افسر موجود ہوں جنہیں اس امر کا قانونی اختیار حاصل ہو کہ جہاں وہ دیکھیں کہ کوئی مقرر اشتعال انگیزی کی طرف آ رہا ہے۔ اسے اس سے فوراً روک دیں۔

(۳) اور ان حفاظتی تدابیر کے ساتھ ساتھ قرآن کی تعلیم کے عام کرنے کا انتظام بھی کیا جائے۔

چونکہ ملک میں قتل کی وارداتیں عام ہو رہی ہیں۔ اس لئے ہم سب سے پہلے حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ بلا مزید تاخیر اپنی مشینری کو حرکت میں لائے اور ان اسباب و ذرائع کو سختی سے روک دے جو ان وارداتوں کا موجب بن رہے ہیں۔ اگر موجودہ صورت حالات کچھ عرصہ کے لئے اور برقرار رہی تو ہمیں ڈر ہے کہ یہ وارداتیں افراد تک ہی محدود نہ رہیں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی شکل بھی اختیار کر جائیں جن کے نتائج کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

اس ضمن میں اتنا اضافہ اور بھی ضروری ہے کہ صرف اشتعال انگیزی ہی کو جرم قرار نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ کسی کے خلاف بہتان تراشیوں کو بھی برابر کا جرم ٹھہرا دینا ضروری ہے۔ اس لئے کہ آجکل عام طور پر ہو یہ رہا ہے کہ بڑے بڑے (بظاہر ذمہ دار) مولوی صاحبان اپنی تقاریر میں اپنے مخالفین کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دیتے ہیں جو مخالفین کبھی نہیں کہتے۔ یہ لوگ پہلے اپنی طرف سے اس قسم کی غلط باتیں وضع کر کے اپنے مخالف کے سر تھوپتے ہیں اور پھر ان باتوں کو وجہ اشتعال بنا کر لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں، ان کی یہ حرکت دوہرا جرم قرار پانی چاہیئے۔

لیکن ان تمام تدابیر کے ساتھ ایک موثر تدبیر ایسی بھی ہے جو خود عوام کے بس کی بات ہے۔ اور وہ یہ کہ جب یہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں شخص کا یا فلاں قسم کے عقیدے رکھنے والوں کا قتل شہادت کا درجہ رکھتا ہے اور قاتل سیدھا جنت میں چلا جاتا ہے تو ان حضرات سے وہیں یہ کہنا چاہیئے کہ صاحب اگر ایسی ہی بات ہے تو آپ اپنے آپ کو شہادت جیسے عظیم درجہ سے محروم کیوں رکھتے ہیں۔ کیا آپ سیدھے جنت میں جانے کے متمنی نہیں ہیں۔ اگر ان اجتماعات میں سنجیدہ حضرات کی طرف سے اس قسم کے

سوال اٹھنے لگ گئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس سے بھی ان کی شعلہ فشانیاں بڑی حد تک کتنی ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ اس قسم کی مذہبی دہشت انگیزی کی روک تھام کا موثر طریقہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم کو عام کر دیا جائے۔ قرآن چونکہ مسلمانوں میں فرقہ بندی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ اس لئے اس میں کھلے لفظوں میں یہ لکھا ہوا تو نہیں ملے گا کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ لیکن اس نے اس بنیادی حقیقت پر بڑا زور دیا ہے کہ اختلاف عقائد کو مٹانے کا طریقہ جبر و استبداد نہیں۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہی اس اقرار کا ہے جو دل کے پورے اطمینان کے ساتھ کیا جائے۔ جو اقرار کسی قسم کے جبر و تشدد اور جور و اکراہ کا نتیجہ ہو اسے وہ ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آسمان کے صفحے پر سورج کی کرنوں سے لکھ دیا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین کے معاملہ میں جور و اکراہ کا کوئی کام نہیں۔ وہ اس معاملہ میں اس حد تک آگے لے جاتا ہے کہ جب چشم بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو اس کی کشادہ نگہی مذہبی رواداری اور وسعت قلب کے احساس سے وجد میں آجاتی ہے۔ اس نے جہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے۔ وہاں کہا ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ۔ وہ جماعت جس سے لوگ جنگ و قتال کر رہے ہیں انہیں اب مخالفین کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت دی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور چونکہ یہ ظلم کی مدافعت میں ہتھیار اٹھا رہے ہیں اس لئے خدا کا قانون ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مخالفین نے ان کے گھروں تک سے نکال دیا۔ حالانکہ ان کا دعویٰ اس کے سوا کچھ اور نہیں تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا نشوونما دینے والا صرف اللہ ہے۔ یہاں تک بات مسلمانوں کی جماعت اور ان کے مخالفین کی ہے۔ لیکن اس کے بعد قرآن نے وہ اصول بیان کیا ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ ظالمین کی دست درازیوں کے روکنے کی تاکید کرتا رہتا ہے ارشاد ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ (۲۲/۴۰-۳۹) اگر اللہ ایسا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی دست درازیوں کو روکنے کے لئے دوسری جماعت پیدا کرتا تو یہودیوں کے معبد عیسائیوں کے کلیسا۔ راہبوں کی خانقاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے سب ڈھا دیئے جاتے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے یہاں کتنی بڑی حقیقت کا اعلان کیا ہے۔ ایک طرف وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ نزول قرآن کے بعد دین خداوندی صرف اسلام ہے لیکن دوسری طرف وہ غیر مسلموں کے معابد تک کی حفاظت کو مسلمانوں کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد قرآن نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ خدا نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر مشیت کے پروگرام کا یہی تقاضا ہوتا کہ تمام انسان مجبوراً ایک ہی دین اور ایک ہی مسلک اختیار کر لیں تو خدا کے لئے ایسا کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ وہ انسانوں کا اختیار و ارادہ سلب کر لیتا اور انہیں حیوانوں کی طرح پیدا کر دیتا۔ پھر جس طرح (مثلاً) تمام بکریاں ایک ہی نہج پر زندگی بسر کرتی ہیں۔ تمام انسان ایک ہی عقیدہ پر چلتے ۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اس نے

انسان کو اختیار و ارادہ دیا کہ جس کا جی چاہے ایمان اختیار کرلے اور جس کا جی چاہے اس کا انکار کر دے۔ لہٰذا اب اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ طوعاً نہیں بلکہ کرہاً اپنے عقیدہ کو چھوڑ کر اس کا ہم عقیدہ بن جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا کے اس پروگرام کے خلاف اعتراض کرتا ہے کہ اس نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا ہے۔ وہ اختلافات کو مٹانے کے لئے علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے حق کی تبلیغ چاہتا ہے۔ جور و اکراہ سے کسی کا عقیدہ نہیں بدلواتا۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ (۹) اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ پھر اسے قرآن سناؤ اس کے بعد اسے اپنی حفاظت میں اس کے محفوظ مقام تک پہنچا دو۔ (اسے زبردستی مسلمان نہ کرو وہ شرک اس لئے اختیار کئے ہوئے ہے کہ وہ توحید کی حقیقت کو جانتا نہیں)۔ آپ سوچئے کہ جب قرآن ایسے معاملہ تک میں زبردستی کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس قسم کی حرکت کو مستحسن قرار دے گا کہ ایک مسلمان اٹھ کر دوسرے مسلمان کے سینے میں خنجر گھونپ دے۔ محض اس لئے کہ وہ کسی مسئلہ میں اس سے اختلاف رکھتا تھا۔ لہٰذا جو لوگ دوسروں کو اس قسم کی حرکات پر اکساتے ہیں وہ سوچیں کہ قرآن کی رو سے ان کا عمل کیسا ہے اور وہ لوگ جو ایسے واعظوں اور مقرروں کی شعلہ فشانیوں سے مشتعل ہو کر دوسروں کی عزت اور جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ وہ غور کریں کہ ان کا یہ فعل بارگاہِ خداوندی میں کن نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اگر مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم کو عام کر دیا جائے تو اس قسم کی فساد انگیزیاں اور تباہ کاریاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ قرآن کی تعلیم کے عام کرنے کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کو قائم کیا جائے جسے دوسرے الفاظ میں خلافت علیٰ منہاج النبوت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو کافر، مرتد، بے دین، ملحد، دہریہ، فتنہ پرداز وغیرہ قرار دے۔ اس میں تمام معاملات امت کے متفقہ علیہ مرکز کی طرف سے طے پائیں گے اور کسی کو تکفیر و تفسیق کی اجازت نہیں ہوگی۔ نہ ہی اس میں حق و باطل کے فیصلے کرنے کا اختیار افراد کو حاصل ہوگا۔ لیکن جب تک وہ نظام قائم نہیں ہوتا اس وقت تک ان مفاسد کا علاج بہرحال ملک کی موجودہ حکومت ہی کو کرنا ہوگا۔ اور اس کا علاج وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یعنی حکومت کسی شخص، ادارہ یا فرقہ کو قطعاً اس کی اجازت نہ دے کہ وہ کوئی ایسی بات تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام میں پھیلائے جس سے کسی کے خلاف ان کے جذبات مشتعل ہوں اور اگر کسی جگہ اس قسم کی واردات ہو تو اس میں اس امر کی پوری پوری تفتیش کی جائے کہ ملزم نے کن باتوں سے مشتعل ہو کر ایسی حرکت کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر حکومت نے اس باب میں پوری پوری احتیاط اور قانون کی بطش شدید سے کام نہ لیا تو (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) اس امر کا اندیشہ ہے کہ ملک میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔ اس لئے کہ آجکل اس قسم کی اشتعال انگیز تقریروں کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔

گذشتہ ماہ (مئی ۱۹۵۷ء) کے طلوع اسلام میں پتوں کی چوری کے متعلق لکھا گیا تھا کہ بعض لوگوں نے اب یہ حرکت

شروع کردی ہے کہ طلوع اسلام کے خریداروں کے پتے کہیں سے چرالیتے ہیں اور ان پتوں پر اپنا لٹریچر بھیجتے ہیں۔ قارئین کے استفسار پر اس سلسلہ میں اطلاعاً عرض ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں ادارۂ تحقیق حق کراچی سے رجسٹرڈ خط کے ذریعے دریافت کیا تھا کہ انھوں نے طلوع اسلام کے خریداروں کے پتے کہاں سے حاصل کئے ہیں مگر انھوں نے کافی عرصہ گذر جانے کے باوجود اب تک اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے علاوہ محکمۂ ڈاک کے ذمہ داران کو بھی اس کے متعلق شکایتی خطوط لکھے گئے تھے۔ مگر اب تک وہاں سے بھی اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔

بہرحال ہم نے اپنے دفتر کے انتظامات اور سخت کردیئے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کی جارہی ہے۔ البتہ اگر آئندہ پھر کسی صاحب کو اس قسم کی کوئی چیز موصول ہو تو وہ براہِ مہربانی اس کا وہ کور ہمیں بھیج دیں۔ جس میں لپیٹ کر لوگ انھیں اپنا لٹریچر بھیجتے ہیں۔ کیونکہ اس سلسلہ میں یہ کور مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔

آئندہ صفحہ پر ایک اہم کتاب یعنی

اسلام میں

قانون سازی

کا اصول

کا اشتہار دیا جارہا ہے۔ یہ وقت کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔ اس اشتہار کو غور سے ملاحظہ فرمالیجئے۔ اور اپنا آرڈر ادارہ کو جلد از جلد بھیج دیجئے۔

۲۔ ماہِ زوال کے دو اہم مضامین

(الف) اندھے کی لکڑی

(ب) اردو زبان میں نماز

پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کئے جارہے ہیں۔ اردو زبان میں نماز کا پمفلٹ تمام بزم ہائے طلوع اسلام کو بھیجا جارہا ہے۔ ممبران کو چاہیئے کہ یہ پمفلٹ پڑھے لکھے لوگوں میں عام طور پر تقسیم کریں۔ تاکہ اس مسئلہ کے متعلق لوگوں پر اصل حقیقت واضح ہوجائے۔

قرآنی فیصلے

روز مرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث

۴۰۸ صفحات قیمت: چار روپے۔

لائحہ کمیشن

کا تقرر عنقریب ہونے والا ہے

ان کے سامنے سب سے پہلا سوال یہ آئے گا کہ اسلام میں قانون سازی کا اصول کیا ہے اگر یہ اصولی بات واضح ہوگئی تو کمیشن اپنا کام صحیح خطوط پر کر سکے گا۔ اور اگر یہ بنیادی غلطی رہی تو اس پر اٹھی ہوئی عمارت کا کوئی گوشہ بھی صحیح نہیں ہوگا۔
ادارۂ طلوع اسلام نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ایک اہم کتاب شائع کر دی ہے جس کا نام ہے

اسلام میں

قانون سازی

کا اصول

اس میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالک اسلامیہ کے بلند پایہ مفکرین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانون شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے۔
یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگا لیجئے۔ قیمت فی جلد مجلد دو روپے آٹھ آنے
نوٹ:۔ پیشگی خریداران کو کتاب از خود بھیجدی جائے گی۔ اگر ان میں سے کوئی صاحب کتاب نہ منگانا چاہیں تو ۱۰ جون تک ادارہ کو مطلع کر دیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۱۵۹/۳۔ ایل (پی ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

بسم اللہ تعالیٰ سبحانہ

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ أَفَلَا تَتَفَكَّرُونَ (۶/۵۰)

اندھے کی لکڑی

پرویز

شائع کردہ

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

سلیم کے نام

(اندھے کی لکڑی)

نہیں سلیم! یہ جو تم نے اندھوں کی قطار دیکھی ہے، یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ہم اپنے بچپن کے زمانے سے انھیں اسی طرح دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہمارے بڑے بوڑھوں نے انھیں دیکھا ہے۔ بس فرق اتنا ہے کہ اُس زمانے میں ان کی تعداد کم تھی۔ اب زیادہ ہو گئی ہے۔ نیز اُس وقت سب سے آگے چلنے والے کو کچھ کچھ نظر آیا کرتا تھا، اب وہ بھی بالکل اندھا ہو چکا ہے اور محض قیاس اور عادت کی مشق کے زور پر اپنے جیسے اندھوں کی راہ نمائی کرتا ہے۔ جب میں نے انھیں دیکھا ہے تو سب سے آگے ایک اور اندھا ہوا کرتا تھا۔ اس کے مرنے پر اُس سے پچھلے اندھے کو ترقی (Promotion) مل گئی۔ اور وہ ان کا راہ نما بن گیا۔ اور لائن کے آخر میں دو چار اندھوں کا اور اضافہ ہو گیا۔ اگلے کی لکڑی پچھلے کے لئے "دلیلِ راہ" یا "مشعلِ ہدایت" بن گئی۔ جس طرف اگلا مڑا، پچھلے بھی مڑ گئے۔ جہاں وہ ٹھیرا، یہ بھی ٹھیر گئے۔ جس قسم کی آواز اس نے نکالی انھوں نے بھی اس کی نقل اتار دی۔ یہ ٹھیک ایک وقت پر بھیک مانگنے کے لئے نکلتے ہیں اور دن بھر متعین راستوں پر چلتے شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ یہی ان کی مقررہ روش ہے جس پر یہ عمر بھر چلتے رہتے ہیں۔ اور چلتے چلتے بالآخر قبر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور چونکہ ساتھ کے ساتھ لائن میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کا یہ سلسلۂ دراز کبھی ختم نہیں ہوتا۔

پہلے دن سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ اندھے بدلتے جاتے ہیں لیکن ان کی لائن بدستور قائم رہتی ہے۔ نہ ان کی روش میں فرق آتا ہے نہ راستوں میں تبدیلی۔ نہ ان کی آواز بدلتی ہے نہ رفتار۔ جب کسی پچھلے سے پوچھئے کہ تم اس راستے پر کیوں جا رہے ہو تو وہ اطمینان سے کہہ دیتا ہے کہ اس لئے کہ مجھ سے آگے چلنے والا اسی راستے پر جا رہا ہے اور جب سب سے آگے چلنے والے سے پوچھئے تو وہ کہہ دیتا ہے کہ میں نے جس کی جگہ لی ہے وہ اسی راستے پر چلا کرتا تھا، اور چونکہ وہ پیشرو مر چکا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ آپ کسی سے پوچھ ہی نہیں سکتے کہ وہ اس راستے پر کیوں چلا کرتا تھا۔

اندھوں کی قطار غور کیجئے پر تمہیں نظر آ جائے گا سلیم! کہ اندھوں کی ایک قطار ہے جو شاہراہِ انسانیت پر روزِ ازل سے آج تک مسلسل و متواتر چلی آ رہی ہے۔ جب کوئی آنکھوں والا ان سے کہتا ہے کہ تم جس راستے پر جا رہے ہو وہ غلط ہے تو وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے بڑوں کو اسی راستے پر چلتے دیکھا ہے اس لئے ہم اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔ ان

حضرت نوح آنکھوں والوں میں سب سے پہلے ہمارے سامنے حضرت نوحؑ آتے ہیں۔ انھوں نے ان سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۲۳/۲۳) تم صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور محکومی اختیار کرو۔ اس

کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار ہستی ایسی نہیں جس کی تم اطاعت کرو۔

بات کس قدر صاف اور واضح تھی لیکن انھوں نے نہ تو اسے قبول ہی کیا اور نہ ہی اس کی تردید میں کوئی دلیل اور برہان پیش کی کہا تو صرف اتنا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴) ہم نے اپنے آباو اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی۔ اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو اس میں ہمارے نزدیک یہ غلطی اور یہ سقم ہے بلکہ یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو چونکہ ہم سے پہلے اندھے اس راستے پر نہیں چلا کرتے تھے اس لئے ہم بھی اسے اختیار نہیں کر سکتے ہم اسی روش پر چلتے جائینگے جس روش پر وہ چلا کرتے تھے۔

حضرت صالح

حضرت نوحؑ کے بعد ہم حضرت صالح کو دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنی قوم سے یہی کہتے ہیں کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۷۳) اس کے جواب میں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۶۲) جن معبودوں کی پرستش ہمارے آباو اجداد کیا کرتے تھے، تو ہمیں ان کی پرستش سے روکتا ہے! یعنی وہی آباء جنھوں نے حضرت نوح اور حضرت ہودؑ کے زمانے میں صحیح روش اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا، اب ان کے لئے دلیل اور سند بن گئے! اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اندھا پہلے مر جائے، وہ بعد میں آنے والوں کے لئے آنکھوں والا بن جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم

اس کے بعد ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ آتے ہیں وہ اپنے باپ اور قوم سے کہتے ہیں کہ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۲۱/۵۲)۔ ان مورتیوں کی حیثیت کیا ہے جن کے سامنے تم جھکتے ہو! تم انھیں اپنے ہاتھوں سے تراشتے ہو اور پھر ان کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہو! سوچو کہ اس روش میں عقل اور انسانیت کی کوئی رمق تک بھی ہے! اس کے جواب میں ان اندھوں نے وہی کچھ کہا جو ان سے پہلے اندھے کہتے تھے قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (۲۱/۵۳)، انھوں نے کہا کہ ہم نے اپنے آباو اجداد کو انہی کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی ان کی پرستش کرتے ہیں، ہم اپنے اسلاف کے راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس جواب پر حضرت ابراہیم کو غصہ تو بہت آیا اور ہر سمجھ دار کو غصہ آئے گا لیکن اُن عقل کے اندھوں سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا تھا کہ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۱/۵۴) تم اور تمہارے اسلاف کس قدر کھلی ہوئی گمراہی میں تھے! لیکن کھلی ہوئی گمراہی تو اسے ہی نظر آ سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ جو آنکھیں بند کئے اگلے اندھے کی لکڑی کے سہارے چلا جا رہا ہو، اسے غلط اور صحیح راستے میں تمیز کس طرح ہو سکتی ہے؟

حضرت شعیب

اور وہ دیکھو سلیم! قومِ مدین سے حضرت شعیب کیا کہہ رہے ہیں! وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۸۵)، اطاعت اور محکومی صرف ایک خدا کے قانون کی ہو سکتی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کوئی اور صاحبِ اقتدار و اختیار نہیں۔ اس کے جواب میں ان کی قوم کیا کہتی ہے! وہی جو ان سے پہلے کے اندھے کہتے تھے۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (۱۱/۸۷)، اے شعیب! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباو اجداد کرتے تھے۔

وہی اندھے کی لکڑی!

حضرت موسیٰ (دعوتِ حق و صداقت کے جواب میں یہی کچھ حضرتِ موسیٰ کے مخالفین نے کہا۔ ان کا جواب یہ تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اس راہ سے پھیر دے جس راہ پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے؟

تم نے دیکھا سلیم! کہ شروع سے آخر تک کس طرح ان اندھوں کی طرف سے ایک ہی جواب ملتا چلا آرہا ہے؟ اندھے اس کے سوا کوئی اور جواب دے ہی نہیں سکتے۔ اُن کے پاس اپنی روش کے جواز میں کوئی دلیل اور برہان نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ دلیل اور برہان تو اس کے پاس ہوتی ہے جس نے کسی راستے کو دیکھ بھال کر اپنے انتخاب سے اختیار کیا ہو۔ لیکن جو شخص کسی راستے پر اس لئے چل رہا ہو کہ اس کے آباؤ اجداد اُسی راستے پر چلا کرتے تھے، اُس کے لئے دلیل و برہان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو گیا تو اس نے مسلمانوں کا سا راستہ اختیار کر لیا۔ اگر ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہو جاتا تو انہی کے راستے پر چلنے لگتا۔

یہ تو انبیائے سابقہ کا تذکرہ تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو آپ کو بھی اس کا وہی جواب ملا جو پہلے انبیاء کرام کو ملا کرتا تھا۔ یعنی حضورؐ کی دعوت پر اگلے اندھے نے پچھلے اندھوں سے کہا کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (۳۴/۴۳) یہ شخص چاہتا ہے کہ جن چیزوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کیا کرتے تھے تمہیں اس راستے سے روک دے مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ (۳۸/۷) جو کچھ یہ کہتا ہے ہم نے اسے اپنے پچھلے مسلک مذہب میں کہیں نہیں سنا۔ اس لئے اس کی بات سچی نہیں ہو سکتی اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷) یہ محض بناوٹ ہے اس کا خود ساختہ دعوےٰ ہے۔

نبی اکرمؐ حق و صداقت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم اپنے اسلاف کی تقلید میں چلتے آئے ہیں۔

غرضیکہ حضرت نوحؑ ہوں یا ہودؑ۔ حضرت صالحؑ ہوں یا شعیبؑ۔ حضرت موسیٰؑ ہوں یا نبی آخر الزماںؐ۔ ہر آنکھوں والے کو اندھوں کی قطار کی طرف سے یہی جواب ملتا رہا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریق پر چلتے دیکھا ہے۔ اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴) ان کے رسول ان سے کہتے رہے کہ جس راستے کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں اگر وہ راستہ تمہارے اسلاف کے راستے سے زیادہ واضح۔ صحیح۔ روشن اور یقینی طور پر منزل کی طرف لے جانے والا ہو، تو کیا تم پھر بھی اسلاف ہی کے راستے کو ترجیح دو گے؟ وہ کہتے کہ ہمارے لئے مقابلہ اور انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ہم کوئی اور بات سننا ہی نہیں چاہتے اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راستے پر چلتے پایا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ پا پر آنکھیں بند کئے چلتے جائیں گے۔ اندھے کی لکڑی سب سے زیادہ محفوظ اور عافیت رساں ہوتی ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵/۱۰۴) اگر صورت یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کو حقیقت کا کچھ علم نہ ہو اور وہ ساری عمر غلط راستے پر چلتے رہے ہوں، تو کیا تم پھر بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے رہو گے؟

جواب ملتا کہ بے شک۔ ہم اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔ اس لئے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴) ہمارے اطمینان کے لئے یہ کافی ہے کہ ہم اپنے آباء کے راستے پر چل رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔

تم نے دیکھا علیم! کہ شاہراہ انسانیت پر کس طرح اندھوں کی ایک قطار ہے جو مسلسل و متواتر ایک ہی ڈگر پر چلے جا رہی ہے ہر پچھلا اندھا اپنے اگلے اندھے کو اپنا ہادی اور راہ نما سمجھتا ہے اور اس کی لکڑی کو اپنی روش کے برسرِ حق ہونے کی دلیل و حجت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ آنکھیں رکھنے کے باوجود اس قسم کی اندھی روش کو پسند کیوں کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کا جواب ایک

مترفین کا مسلک

لفظ میں دیدیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (۴۳/۲۳) اسی طرح ہم نے جس قوم کی طرف بھی کوئی رسول بھیجا، تو اس قوم کے مترفین نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک روش پر چلتے پایا ہے۔ اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ مُتْرَفِيْنَ کے معنی ہیں وہ لوگ جو خود کچھ کام نہ کرنا چاہیں اور دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائیں۔ سہل انگار۔ محنت سے جی چرانے والے۔ اس میں دونوں باتیں آگئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اندھی تقلید میں انسان کے ذہن کو ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ سوچ سمجھ کر راستہ اختیار کرنے کے لئے انسان کو بڑی ذہنی کاوش اور فکری جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ کچھ آسان کام نہیں۔ اس کے برعکس، اسلاف کی پامال راہوں اور آباء و اجداد سے وراثتاً منتقل ہو کر آنے والے مسلک پر چلنے کے لئے کسی سعی و کاوش اور تگ و تاز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کوئی سوال سامنے آئے اس کے متعلق بس اتنا بتانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس باب میں فلاں امام نے یہ کہا ہے اور فلاں بزرگ کا یہ ارشاد ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی فکری کاوش درکار نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی قوموں میں سب سے بڑا عالم وہ ہوتا ہے جسے سب سے زیادہ حوالے یاد ہوں۔ یعنی جو سب سے بڑا (Catalog) ہو وہ سب سے بڑا عالم ہوتا ہے۔ اس کے لئے صرف حافظہ (Memory) کی ضرورت ہوتی ہے۔ فکر (Intellect) کی ضرورت قطعاً نہیں ہوتی۔

دوسرے یہ کہ اس روش سے روٹی بڑی آسانی سے مل جاتی ہے۔ عوام جس راستے پر چل رہے ہوں، آپ اس کی تائید کرتے جایئے۔ پھر دیکھئے کہ کس طرح آپ کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ جو تم بڑی بڑی مقدس دکانیں دیکھ رہے ہو اور ان کی بکری پر اس قدر متعجب ہوتے ہو، تو ان کی تجارت کا راز (Trade Secret) ہی یہ ہے کہ عوام کو مطمئن اور خوش رکھا جائے۔ اور عوام کے خوش رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے کہا جائے کہ جس راستے پر تم اور تمہارے آباء و اجداد چلتے آئے ہیں وہ سیدھا جنت میں لے جانے کا ہے۔

تجارت کا راز

تجارت کا دوسرا راز یہ ہے کہ ہم پیشہ لوگ آپس میں کتنا ہی سر پھٹول کیوں نہ کریں، جونہی کوئی باہر کا آدمی اس پیشہ کے خلاف کچھ کہے سب اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ بنالیں۔ یعنی ان کی باہمد گر پیوستگی کا موجب صرف اس پیشہ کا مفاد ہوگا۔ یہ جو تم مختلف پیشوں (Professions) والوں کی (Unions) دیکھتے ہو تو ان کی

وجہ جامعیت اپنے پیشے کے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے اور بس۔ یہی وہ چیز ہے جو مذہبی مترفین کو باہم دگر مربوط رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو حضرت ابراہیمؑ نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا تھا جب انھوں نے بت خانہ کے مترفین (مذہبی پیشواؤں) سے کہا کہ تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو جانتے ہیں کہ بتوں کی حقیقت کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جو اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے کیونکہ ان بتوں کی وجہ سے اُن کا مذہبی جتھہ بنا ہوا ہے۔ اگر اس جتھہ میں کمزوری آجائے تو یہ جو اس وقت عیش کی زندگی گذر رہی ہے وہ باقی نہیں رہے گی وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۹/۲۵) ابراہیمؑ نے کہا کہ تم نے خدا کو چھوڑ کر بت پرستی اس لئے اختیار کر رکھی ہے کہ اس کی رُو سے دنیاوی زندگی میں تم میں باہمی ربط اور پیوستگی قائم رہتی ہے۔ اس سے تمہارا جتھہ بنا ہوا ہے اور جتھے میں رہتے ہوئے تمہیں بہت سے مفاد حاصل ہیں۔

اس جتھے کو مضبوط رکھنے کے لئے ان کی تکنیک یہ ہوتی ہے کہ جونہی انھیں کسی طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہوا انھوں نے یہ کہہ کر عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ دیکھنا یہ شخص تمہارے دین میں فتنہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تمہیں اس روش سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر تمہارے آباء اجداد چلتے تھے۔ یہ کہتا ہے کہ تمہارے اسلاف گمراہ تھے۔ اگر تم نے اس فتنہ کا سر نہ کچلا تو یہ تمہارے معبودوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اٹھو۔

عوام کو بھڑکا کر

قَالُوا اقْتُلُوْهُ (۲۹/۲۴) اسے قتل کر دو۔ حَرِّقُوْهُ۔ اسے زندہ جلا دو۔ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ (۲۱/۶۸) اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔ یہی وہ حربہ ہے جسے فرعون نے حضرت موسےٰ کے خلاف استعمال کرنا چاہا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا کہ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (۲۰/۴۷) تم بنی اسرائیل پر ظلم و ستم سے باز آجاؤ اور انھیں ہمارے ساتھ جانے دو تاکہ یہ آزادی کی فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ بجائے اس کے کہ فرعون اس نقطہ پر بات کرتا اس نے بات کا رخ بدل کر چاہا کہ حضرت موسےٰ کو خار دار جھاڑیوں میں الجھا دیا جائے۔ فرعون کے دربار میں اس کے امراء و وزراء بیٹھے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی باطل پرست تھے اور ان کے آباء و اجداد بھی گمراہ۔ فرعون نے حضرت موسےٰ سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۲۰/۵۱) جو لوگ پہلے گذر چکے ہیں (یعنی ان امراء و وزراء کے اسلاف) وہ کس حال میں ہیں؟ ان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ صاف ظاہر ہے کہ اس سوال سے فرعون کے پیش نظر کیا شرارت تھی؟ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے کون ہے؟ اس کے سامنے تھا خدا کا رسول جو ایسے مقامات کی نزاکتوں سے خوب واقف ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى (۲۰/۵۲) ان کا علم میرے رب کے ہاں مکافاتِ عمل کے رجسٹر میں درج ہے۔ وہ اس باب میں نہ بھولتا ہے نہ غلطی کرتا ہے۔ ان کا معاملہ اُس کے ساتھ ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دیتے ہو یا نہیں۔

یہی کچھ مترفین کا طبقہ پہلے کرتا تھا۔ یہی کچھ وہ آج کرتا ہے۔ جونہی کسی نے ان سے کہا کہ جس روش پر تم چل رہے ہو

دورِ حاضر میں

اور عوام کو چلا رہے ہو، اس کے متعلق اتنا تو دیکھ لو کہ یہ قرآن کے مطابق صحیح ہے یا غلط۔ تو انہوں نے عوام کو بھڑکانا شروع کر دیا کہ اقتلوہ وحرقوہ۔ پکڑلو۔ جانے نہ دو۔ یہ فتنہ ہے۔ اس کا سر کچل دو۔ مقصد اس سے صرف یہ کہ کہیں ان کی بے بصری کا پول نہ کھل جائے اور جو عیش بغیر محنت کئے حاصل ہیں، ان پر زد نہ پڑے اس کے لئے ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ قوم کو سوچنے سے باز رکھا جائے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان کے متبعین نے سوچنا شروع کر دیا تو وہ ان سے باغی ہو جائیں گے۔

لیکن اس سے سلیم! اتنا ہی نہیں ہوتا کہ قوم وقتی طور پر سوچنا چھوڑ دیتی ہے اس کا اثر بہت دور رس اور اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی ذی حیات کچھ عرصہ تک اپنے کسی عضو سے کام لینا چھوڑ دے اور یہ روش کچھ نسلوں تک متواتر قائم رہے، تو اس کے بعد وہ عضو ہی مفقود ہو جاتا ہے۔ تمہیں یاد ہے نئی دہلی میں گول ڈاک خانے کے قریب ایک اندھا لڑکا بھیک مانگا کرتا تھا۔ لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ وہ لڑکا شروع میں اندھا نہیں تھا۔ اس نے اندھا بن کر بھیک مانگنی شروع کی۔ دن بھر وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہتا۔ دو چار سال کے بعد اس کی بینائی سچ مچ جاتی رہی۔ یہی حال قوموں کا ہے جب کوئی قوم اندھی تقلید کا مسلک اختیار کر کے، غور و فکر کرنا چھوڑ دے تو کچھ مدت کے بعد اس قوم سے غور و فکر کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ تم مجھ سے بار بار پوچھا کرتے ہو کہ مسلمانوں میں ارباب فکر و نظر کا اس قدر قحط کیوں ہے۔ ان کے ہاں صاحبانِ عقل و بصیرت کیوں پیدا نہیں ہوتے۔ جبکہ دنیا کی دوسری قوموں میں ان کی اتنی فراوانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم نے صدیوں سے فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے فطرت کے اٹل قانون کے مطابق، ان سے فکر و تدبر کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے۔ اس گول ڈاک خانے والے اندھے کی طرح ان کی بینائی سلب ہو چکی ہے۔

تقلید کا طوق

تقلید کا یہی نتیجہ ہوتا ہے إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ (۳۶/۸) ان کی گردنوں میں ایسے طوق ڈال دیئے جاتے ہیں جن سے ان کے سر اٹھے کے اٹھے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنی گردن تھوڑی سے نیچے کر نہیں سکتے۔ اس لئے انہیں اپنے سامنے کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (۳۶/۹) ان کے سامنے بھی روک پیدا ہو جاتی ہے اور ان کے پیچھے بھی۔ ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور ان کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۳۶/۱۰) انہیں سمجھانا نہ سمجھانا برابر ہوتا ہے یہ کبھی سیدھا راستہ اختیار نہیں کریں گے إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ (۳۷/۶۸) ان کی یہ روش انہیں جہنم کی طرف کھینچ کر لے جائے گی۔ اس لئے کہ إِنَّهُمْ أَلْفَوْا آبَاءَهُمْ ضَالِّينَ (۳۷/۶۹)۔ انہوں نے جس گمراہ کن روش پر اپنے باپ دادا کو پایا، اسی روش پر یہ خود چلے جا رہے ہیں۔ چونکہ ان کی نگاہیں ہمیشہ اسلاف کی طرف لگی رہتی ہیں اس لئے ان کے ذہن میں ماضی تو درخشندہ اور تابناک ہوتا ہے اور مستقبل تیرہ و تار۔

ان سے جب سنئے یہ اپنے ماضی کے قصے دہراتے رہیں گے اور اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ ماضی کو ست جگ (حق و صداقت کا زمانہ) اور مستقبل کو کل جگ (تباہی کا دور) قرار دیں گے۔ تمہیں یاد ہے شملہ میں وہ لڑکا۔ فتو گوجر۔ جب تمہیں راستہ دکھلانے کے لئے سڑک تک جاتا تھا تو لالٹین لے کر تمہارے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور تمہیں بار بار کہنا پڑتا تھا کہ روشنی لے کر آگے آگے چلو۔ لالٹین کے پیچھے رکھنے سے، طے کردہ راستہ تو روشن ہو جاتا تھا لیکن سامنے کا راستہ خود تمہارے سائے سے تاریک تر ہو جاتا تھا۔ یہی حالت ماضی پرست قوم کی ہو جاتی ہے۔ اس کے نزدیک گذرا ہوا زمانہ درخشندہ ہوتا ہے اور اپنا زمانہ اور آنے والا دور تاریک۔ یہی وہ جہنمی ذہنیت ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وہاں چہرے الٹے ہوتے ہیں۔ یعنی آنکھیں سامنے کی طرف ہونے کی بجائے پیچھے کی طرف ہوتی ہیں یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ (۳۳/۶۶)۔ اس کی وجہ کیا ہوتی ہے اس کی تصریح اگلی آیت میں کر دی جہاں فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷) بجائے اس کے کہ ہم اپنی عقل و فکر سے کام لے کر زندگی کی صحیح روش پر چلتے جو خدا نے متعین کی تھی، ہم اپنے بڑوں کی اطاعت کرتے رہے اور انہوں نے ہمیں یوں گمراہ کر دیا۔ یہی ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ لوگ انسانی سطح سے نیچے گر کر حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ "بھیڑ چال" کا محاورہ حیوانی سطح کا آئینہ دار ہے۔ اندھوں کی یہ قطار انسانوں کا گروہ نہیں بلکہ حیوانوں کا گلہ ہوتی ہے۔

حیوانی سطح کی زندگی

دیکھو سلیم! قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ انسان شہری ہوں یا دیہاتی۔ ان کے اکثریت جہنم ہی کے اندر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سینے میں دل تو رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن اُن سے دیکھنے بھالنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ان کے کان بھی ہوتے ہیں، لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یہ دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں کی مانند ہوتے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔ اس لئے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں کہ انسانیت نام ہی اس کا ہے کہ اپنی عقل و فکر سے کام لیا جائے۔ اندھوں کی قطار میں چلنے والے انسان نہیں حیوان ہوتے ہیں۔ بھیڑ چال، انسانیت کا خاصہ نہیں حیوانی روش ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں بانداز دگر بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ

قرآن کی نہیں۔ اسلاف کی اتباع

مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (قرآن) کی اتباع کرو تو یہ کہتے ہیں کہ نہیں۔ ہم تو اسی مذہب کی اتباع کرتے رہیں گے مَا اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا ہے کہ خواہ تمہارے آباء و اجداد کچھ بھی عقل و شعور نہ رکھتے ہوں اور غلط راستوں پر چلتے رہے ہوں، تم اس پر بھی انہی کی پیروی کرتے رہو گے؟ (۲/۱۷۰) اس کے بعد ہے وَمَثَلُ

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً یہ لوگ جو سیدھے راستے پر چلنے سے انکار کرتے ہیں، ان کی مثال یوں سمجھو کہ بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہے اور ان کے پیچھے ایک چرواہا۔ چرواہے نے اپنے بڑے بوڑھوں سے کچھ آوازیں سیکھ رکھی ہیں بلا الفاظ اور کچھ الفاظ یاد کر رکھے ہیں بلا معنی و مطلب۔ یہ وہ آوازیں نکالتا اور الفاظ دہراتا ہے اور بھیڑیں بکریاں جو ان اشاروں کی عادی ہو چکی ہیں، بلا سوچے سمجھے اِدھر اُدھر مڑ جاتی ہیں۔ بس یہی حالت آباء کی تقلید کرنے والوں کی ہے صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۲/۱۷۱) بہرے، گونگے۔ اندھے۔ عقل و خرد سے کام نہ لینے والے جانور۔ انہیں انسان کون کہہ سکتا ہے؟۔

اس آیت پر پھر غور کرو سلیم! کہ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ما انزل اللہ (قرآن) کی اتباع کرو تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس مذہب و مسلک کی پیروی کرتے رہینگے جس پر ہمارے آباء و اجداد چلتے رہے ہیں۔ یعنی قرآن، ما انزل اللہ کی اتباع اور مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (اسلاف کے مسلک) کی اتباع کو ایک دوسرے کے مقابل لایا ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ چیز جس طرح نزول قرآن کے زمانے میں حقیقت تھی۔ اُسی طرح آج بھی حقیقت ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے فرقے ہیں۔ جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق میں الجھے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کو برداشت (Tolerate) کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان سب میں قدر مشترک اسلاف کی تقلید ہوتی ہے (فرقہ بنتا ہی اسلاف کی تقلید سے ہے) لیکن اگر کوئی شخص انہیں قرآن کی اتباع کی طرف دعوت دے تو یہ سب پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور اُسے "دین" کے لئے عظیم فتنہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے۔ مختلف فرقے، ایک دوسرے سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ رکھیں، ان میں سے کوئی بھی مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف آواز اسی کی ہوتی ہے جو قرآن کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ آواز ان میں سے کسی کے لئے بھی قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ قرآن نے سورۂ بقر کی ایک آیت میں بیان کی ہے۔ لیکن اس آیت کے سامنے آنے سے پہلے، ایک اہم نکتہ کا تمہید اً سمجھ لینا ضروری ہے۔

بچہ کی ذہنیت

بچہ اپنی پیدائش کے بعد، اپنی مملکت میں آپ حکمراں ہوتا ہے۔ جب جی چاہتا ہے سوتا ہے جب جی چاہتا ہے جاگتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو اس کی ایک آواز (رونے) پر دودھ حاضر ہو جاتا ہے۔ سردی لگتی ہے تو خود بخود کپڑا اس کے اوپر آجاتا ہے۔ گرمی لگتی ہے تو پنکھا ہلنے لگ جاتا ہے وقس علیٰ ہذا۔ لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اس کے ان اختیارات و اقتدارات میں کمی واقع ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اب وہ گھر میں اپنے بجائے ایک اور شخصیت کو صاحب اختیار و اقتدار دیکھتا ہے۔ یہ شخصیت اس کے باپ کی ہوتی ہے۔ وہ گھر کا حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے۔ وہی کھانے پینے کو دیتا ہے۔ اُسی کا فیصلہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں قولِ فیصل ہوتا ہے۔ گھر کا ہر فرد اسی سے ہدایات لیتا اور اسی کے اشارات پر چلتا ہے۔ یہ آسرا بچے کے لئے بہت بڑا آسرا اور سہارا بہت محکم سہارا ہوتا ہے۔ جس قوم میں بچوں

کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام ہو اس کے بچے، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ذہنی پختگی میں بھی بڑھتے جاتے ہیں تاآنکہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ (ذہنی طور پر) باپ کے سہارے کے محتاج نہیں رہتے۔ لیکن جن قوموں میں بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام نہیں ہوتا (اور زوال آمادہ اقوام میں یہی ہوتا ہے) اس کے بچے عمر کے لحاظ سے تو جوان ہو جاتے ہیں لیکن ذہنی اعتبار سے بچے کے بچے ہی رہتے ہیں۔ اس لئے وہ عمر بھر سہاروں کے محتاج رہتے ہیں۔ جب تک باپ زندہ ہو، ہر معاملہ میں راہنمائی اور فیصلے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب وہ مر جائے تو وہ زندگی کے ہر دوراہے پر، ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں ان کے آباء و اجداد کے اقوال اور فیصلے درج ہوں۔ ایسی قوموں کے نزدیک آباء و اجداد کی عقل سے بڑھ کر کسی کی عقل اور ان کے فیصلوں سے بہتر کسی کے فیصلے نہیں ہوتے۔ وہ اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ اسلاف کے نقشِ قدم پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں۔ وہ یہ کچھ کرتے تو اس لئے ہیں کہ ان کا اپنا ذہن ناپختہ ہوتا ہے اور اس میں معاملات کے فیصلے کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ انسان کا نفس بڑا حیلہ تراش واقع ہوا ہے اس لئے وہ انھیں یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ وہ ایسا کچھ اپنی ذہنی کمزوری کی وجہ سے کرتے ہیں (کیونکہ اس سے انھیں شکستِ پندار ہوتی ہے) بلکہ انھیں سمجھاتا یہ ہے کہ وہ یہ کچھ اسلاف کے احترام اور بزرگوں کی تعظیم کی وجہ سے کرتے ہیں۔ وہ انھیں کہتا یہ ہے کہ اُن کی تعظیم و احترام کا تقاضا ہے کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

اگر ان کی کسی بات کے متعلق علم بھی ہو جائے کہ وہ غلط ہے تو بھی اس پر گرفت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ سمجھنا یہی چاہیئے کہ ان کی اس غلطی میں بھی مصلحت کا کوئی پہلو ہوگا۔ رفتہ رفتہ اسلاف کا یہ احترام ان کے دل میں اس درجہ راسخ ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی کسی غلطی کی طرف اشارہ کرے تو اس سے انھیں اسی طرح غصہ آجاتا ہے جیسے کسی نے ان کے باپ کو گالی دی یا ان کے معبود کی شان میں گستاخی کی ہو۔ اسی کا نام اسلاف پرستی (Ancestor Worship) ہے جسے قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے سورۂ البقرۃ کی اس آیت میں بیان کیا ہے جس میں کہا ہے کہ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (۲/۱۶۵) ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ اوروں کو اُسی جیسا معبود بنا لیتے ہیں اور ان میں ایسی ہی کشش و جاذبیت محسوس کرتے ہیں جیسی خدا میں کرنی چاہیئے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا کے بتائے ہوئے راستے کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے لئے قانونِ خداوندی کی کشش و جاذبیت سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (۲/۱۶۵)

مسلمانوں کی ذہنیت

قرآن کے متعلق مسلمانوں کی ذہنیت یہ ہو چکی ہے کہ جب ان کے سامنے اس قسم کی آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ یہودیوں کے متعلق ہے۔ یہ عیسائیوں کے متعلق۔ فلاں آیت قریش مکہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔ فلاں منافقینِ مدینہ کے متعلق۔ گویا یہ تمام آیات دوسروں کے متعلق ہیں۔ ہمارا ان سے (اور ان کا ہم سے) کوئی واسطہ نہیں۔ یہی کچھ ہم اُن آیات کے متعلق کہہ دیتے ہیں جن میں قرآن نے اسلاف کی تقلید سے

منع کیا ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ آیات یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کے متعلق ہیں۔ ہمارے متعلق نہیں حالانکہ قرآن کے یہ قوانین ابدی ہیں اور ہم پر بھی ان کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے۔ جس طرح اس کے زمانۂ نزول کے مخاطبین پر ہوتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم اسے گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ ان آیات کو اپنے اور اپنے اسلاف کے متعلق قرار دیں۔ اس سے ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے ہمارے بزرگوں کی سوء ادبی ہوتی ہے۔ جہاں تک دل کو ٹھیس لگنے کا تعلق ہے آپ سوچئے کہ ان آیات سے جس طرح آپ کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اسی طرح ان لوگوں کے دل کو بھی تو ٹھیس لگتی ہے جن کے متعلق (آپ سمجھتے ہیں کہ) یہ آیات آئی ہیں۔ اپنے دل کی ٹھیس کا اس قدر خیال کرنا اور دوسروں کے دل کی ٹھیس کی ذرا بھی پرواہ نہ کرنا، یہ تو کچھ اچھی ذہنیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنی تعلیم کے سلسلہ میں "اپنے اور پرائے" میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ بلکہ یوں کہئے کہ ان قوانین کے بیان کرتے وقت "اپنا پرایا" اس کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور یہ بتا دیتا ہے کہ جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے ان کا انجام یہ ہوگا۔ اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کی روش کے عواقب یہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی ہر قوم (مسلم و غیر مسلم) سے کہتا ہے کہ وہ اسی اصول کی روشنی میں اپنی اپنی روش کا جائزہ لیں اور خود اندازہ کر لیں کہ اس روش کا نتیجہ کیا مرتب ہوگا۔ اس میں کسی کے دل کو ٹھیس لگنے یا نہ لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی شخص (یا گروہ) اس بات سے برا مان لیتا ہے کہ قرآن نے اس کی یا اس کے اسلاف میں سے کسی کی غلط روش کو غلط کیوں کہا ہے تو وہ برا مانا کرے۔ قرآن اس کے جذبات کی رعایت سے غلط کو صحیح کبھی نہیں کہہ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں برا ماننے کی بات ہی کچھ نہیں۔ اگر تم پر (قرآن کی روشنی میں) یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ تمہاری فلاں روش غلط ہے تو تم اسے چھوڑ دو۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ تمہارے اسلاف میں سے فلاں کی روش غلط تھی تو تمہیں اس سے کچھ تعلق نہیں۔ وہ اپنے معاملات کا آپ ذمہ دار تھا۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ یہ (تمہارے اسلاف) گذر چکے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ جو کچھ انھوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذمہ دار تم ہو۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۳۴) تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا؟ اس لئے اس میں تمہارے برا ماننے کی کیا بات ہے؟

برا ماننے کی بات نہیں

لیکن اسلاف پرستی کا برا ہو کہ وہ انسان کو صداقت پسندی کی طرف آنے ہی نہیں دیتی!

پھر اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ تم اپنے اسلاف کے متعلق یہ فیصلہ کر لو کہ ان کی ہر بات غلط تھی وہ کہتا صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لو۔ جو باتیں ان میں سے قرآن کے مطابق ہوں انھیں صحیح سمجھو۔ جو اس کے مطابق نہ ہوں، انھیں غلط سمجھو۔ اس لئے کہ صحیح اور غلط کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ (۲/۱۲۰) ہدایت تو صرف وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملی ہے۔

اس مقام پر ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ ان (اسلاف پرست) حضرات کے سامنے جب اسلاف میں سے کسی کی کوئی ایسی بات پیش کی جائے جو قرآن کے خلاف ہو، تو یہ اس کے جواب میں کہدیتے ہیں کہ اُن کے سامنے بھی قرآن تھا اور وہ ہم سے بہتر قرآن سمجھتے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انھوں نے کہا ہے (اگرچہ وہ ہمیں قرآن کے خلاف نظر آتا ہے لیکن ہمیں یہی سمجھنا چاہیئے کہ) وہ قرآن کے خلاف نہیں ہے۔ اس دلیل کو سلیم! ذرا آگے بڑھاؤ تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ (اس خیال کے مطابق) قرآن اب ہمارے لئے بے کار ہے۔

قرآن کا فائدہ؟

اس لئے کہ قرآن کی ہر آیت کے متعلق اسلاف نے کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے اور چونکہ ہم نے اسی کو قرآن کی تعلیم سمجھنا ہے جسے ان اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ان اسلاف کے نوشتے ضروری رہ گئے۔ نہ کہ قرآن۔ اگر ہمارے پاس یہ نوشتے موجود ہوں اور قرآن نہ ہو، تو اس سے کچھ کمی واقع نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمارے لئے قرآن بے کار ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا مصرف صرف اس کی تلاوت (پڑھ لینا) رہ گیا ہے عمل اسی پر ہے جو اسلاف نے لکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہمارے زمانے میں جو لوگ قرآن کی تفاسیر لکھتے ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ سے زیادہ زبان ان کی اپنی ہوتی ہے مطالب و معانی سب وہی ہوتے ہیں جو اسلاف نے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر کوئی شخص قرآن کا کوئی ایسا مفہوم بیان کرے جو اسلاف کے بیان کردہ مفہوم سے مختلف ہو، تو اس کی اس کوشش کو مردود، اور اسے دین کے لئے فتنہ قرار دیدیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں قرآن کی وہی تفسیر معتبر سمجھی جاتی ہے جو حرفاً حرفاً سلف کے مسلک کے مطابق ہو۔

تدبر و تفکر

قرآن میں بے شمار آیات ہیں جن میں تدبر و تفکر (غور و فکر) کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ یہ حکم کسی خاص زمانے کے لوگوں کے لئے ہے اس کے بعد یہ حکم منسوخ سمجھا جائے۔ لہٰذا تدبر فی القرآن کا حکم ہمارے لئے بھی ویسا ہی ہے جیسا ہمارے اسلاف کے لئے تھا۔ لیکن ان حضرات کے تصور کے مطابق، ہمارے لئے یہ حکم منسوخ ہے۔ تدبر جو کچھ کیا جانا تھا، اسلاف نے کر لیا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو انھوں نے بھی تدبر نہیں کیا (بلکہ کسی نے بھی نہیں کیا) اس لئے کہ سب سے پہلے قرآن پر تدبر نبی اکرمؐ نے کرنا تھا۔ لیکن ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق، حضورؐ کو قرآن کی تفسیر بھی وحی کے ذریعے بتا دی گئی۔ اس لئے آپ کے لئے تدبر کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ آپ کے بعد ہمارے اسلاف کے لئے بھی تدبر کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ قرآن کی تفسیر روایات میں آچکی تھی۔ اور روایات کی موجودگی میں تدبر کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس کے بعد ہم ہیں۔ اور ہمارے لئے بھی تدبر کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا سوچئے کہ قرآن نے جو تدبر و تفکر کا حکم دیا ہے تو وہ کس کے لئے ہے؟

یہ تمہیں معلوم ہی ہے سلیم! کہ

(۱) خدا نے دین کو قرآن میں مکمل کر دیا اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ اس کے بعد سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا۔

(۲) رسول اللہؐ نے اپنی احادیث (بقتضیر قرآن) کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔ نہ ہی خلفائے راشدین یا دیگر صحابہؓ نے کوئی ایسا مجموعہ مرتب کیا۔

اس سے انسان ایک ہی نتیجہ پر پہنچتا ہے اور وہ یہ کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے امت کے لئے تدبر کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

انسان بالغ ہوچکا ہے

قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسانیت کو پہلی مرتبہ بالغ Treat: کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو زندگی کے محکم اور غیر متبدل اصول دیکر کھلا چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان قوانین کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل آپ تلاش کرے۔ اسی کا نام تدبر فی القرآن اور تفکر فی الکائنات ہے۔ یہ وجہ ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے اپنے ارشادات کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا۔

ہذا سوچو سلیم! کہ تدبر و تفکر کے جس دروازے کو خدا اور اس کے رسول نے اس طرح کھلا چھوڑا تھا، ہماری اسلاف پرستی کے جذبے نے اسے کس بری طرح سے بند کر رکھا ہے۔ انھوں نے (خدا اور رسول نے) انسان کو بالغ قرار دیا تھا ہم نے اپنے آپ کو پھر بچہ بنا لیا اور زندگی کے ہر قدم پر فیصلوں کیلئے پیچھے تکنے لگ گئے۔ اپنی اس سہل انگاری اور عافیت کوشی کا نام اتباعِ سلف رکھ لیا اور اپنے ذہن کی ناپختگی کو بزرگوں کے احترام کے مقدس نقاب میں چھپانے کی کوشش کرنے لگے اور یوں اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ ہم زندگی کے صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ حالانکہ ان بزرگوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ تم نے ہماری بات کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لینا۔ اُن کے متعلق ایسی روش کا اختیار کرنا خود ان کی منشاء کے خلاف ہے اور ناراضگی کا باعث۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اِذْ تَبَرَّأَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (۲/۱۶۶)

اسلاف بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے

جب وہ لوگ جنھیں دوسروں نے اپنا پیشوا بنا لیا تھا، اپنے ان متبعین سے اظہارِ بیزاری کریں گے۔ اور یہ متبعین عذابِ خداوندی کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور جن سہاروں کو وہ اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے (یعنی تقلیدِ اسلاف) وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے نظر آئیں گے۔ تو اُس وقت انھیں یہ حسرت ہوگی کہ اگر زندگی کا دھارا ایک بار کہیں پیچھے کی طرف مڑ جائے تو پھر ہم اپنے ان پیشواؤں سے اسی طرح اظہارِ بیزاری کریں جس طرح انھوں نے ہم سے اظہارِ بیزاری کیا ہے (۲/۱۶۷)۔ لیکن انھیں معلوم نہیں کہ زندگی کا دھارا پیچھے کی طرف کبھی نہیں مڑا کرتا۔ زندگی وہ جوئے رواں ہے کہ اس میں جو پانی آگے نکل گیا وہ واپس نہیں آسکتا۔ زندگی آواگون کے چکر (تناسخ) میں نہیں گھومتی۔ یہ سیدھے راستے پر آگے کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے ظہورِ نتائج کے وقت اس کی آرزو کرنا کہ ہمارے اعمال واپس کر دیئے جائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر لیں، موہوم خیال اور ناکام آرزو ہوگی۔

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا سلیم! کہ ہمارے اسلاف میں سے جو فی الواقع صالح تھے انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا ہوگا کہ تم ہمارے اقوال کی اندھی تقلید کرتے رہو۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہوگا کہ اطاعت صرف احکامِ خداوندی کی کی جائے گی۔ تم ہمارے اقوال

کو بھی کتاب اللہ کی سند اور تائید کے بغیر مت مانو۔ باقی رہے وہ لوگ جو دیدہ و دانستہ دوسروں کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں تاکہ اس سے ان کی "دکانداری" بڑھے۔ تو قرآن نے کئی ایک مقامات میں اُس منظر کا نقشہ کھینچا ہے جب یہ پیشوا اور ان کے متبعین جہنم میں جمع ہوں گے اور وہاں ایک دوسرے کو مطعون کریں گے کہ تم ہماری تباہی کا باعث ہو۔ مثلاً سورۃ ابراہیم میں ہے کہ

جہنم میں مکالمہ

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ۔ یہ متبعین اپنے پیشواؤں سے (یہ محکوم اپنے حاکموں سے) کہیں گے کہ ہم تمہاری اتباع کیا کرتے تھے۔ تو کیا تم اس عذاب خداوندی سے جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے ہم کو دور نہیں کرو گے؟ اسکے جواب میں وہ پیشوایانِ مذہب اور ہادیانِ سیاست اُن سے کہیں گے کہ لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ اگر اس عذاب سے نکلنے کا کوئی راستہ ہمیں دکھائی دیتا تو ہم تمہیں بھی وہ راستہ دکھا دیتے اس وقت تو جس طرح بے بس اور لاچار تم ہو ہم بھی ویسے ہی ہیں سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ (۱۴/۲۱) اب چیخنے چلانے سے کیا حاصل ہے یہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہی نہیں۔ اس لئے اب اس عذاب کو برداشت کرنا ہوگا۔

سورۃ سبا میں ان کے باہمی مکالمات کو ذرا تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ۔ یہ متبعین اپنے سرداروں اور پیشواؤں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔ تم ہی نے ہمیں گمراہ کیا۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ وہ پیشوایان اور سرداران اُن سے کہیں گے کہ تم ہمیں موردِ الزام کس منہ سے قرار دیتے ہو؟ خدا کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی کیا ہم نے تمہیں اس کی اتباع سے زبردستی روکا تھا؟ تم نے خود ہی اسکی اتباع کے بجائے ہمارے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو؟

تم نے دیکھا سلیم! ان پیشواؤں نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟ یہ جواب کہ اللہ کی کتاب تمہارے پاس موجود تھی۔ تمہیں کس نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ کر ہماری تقلید کرو؟ تم نے خود ہی ہمیں معبود بنا لیا۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ اسکے جواب میں وہ کہیں گے کہ بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا (۳۴/۳۳)۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم ہمیں ڈنڈے کے زور سے اپنے پیچھے نہیں لگایا کرتے تھے لیکن تم دن رات ایسی تدبیریں کیا کرتے تھے جن سے ہم قانونِ خداوندی سے انکار کر کے تمہیں خدا کا ہمسر بنالیں ہم ان تدبیروں کے حریف نہیں ہو سکتے تھے اسلئے تمہاری اتباع اختیار کر لیتے تھے۔ یہ بھی تو جبری اطاعت ہی تھی اگرچہ اسکے لئے جو طریق تم نے اختیار کیا تھا اس میں بظاہر جبر نہیں دکھائی دیتا تھا۔

سلیم! اس مکالمہ پر غور کرو اور پھر دیکھو کہ قرآن کس کس انداز و اسلوب سے بیانِ حقیقت کرتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ یہ عوام (متبعین) کہیں گے رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! ہم نے اپنے سرداروں اور پیشواؤں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے گمراہ کر دیا۔ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۔ (۳۳/۶۸) ہمارے ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دے ایک ان کی اپنی غلط روی کی وجہ سے اور ایک اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔ اس لئے انہیں خوشگواریوں اور سعادتوں سے دُور رکھ۔ بہت دُور۔

سورۂ اعراف میں یہی مکالمہ اسلاف اور اخلاف کے درمیان بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بعد میں آنیوالی نسل اپنی پیشرو نسل کے متعلق کہیگی کہ انھوں نے ہمیں گمراہ کر دیا۔ اسلئے انھیں دگنا عذاب ملنا چاہیئے اس کا انھیں جواب ملیگا کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ تم میں سے ہر ایک کو دگنا عذاب ملیگا۔ پہلی نسل کو اسلئے کہ وہ خود غلط روش پر چلے اور آنیوالوں کے لئے غلط روی کا نمونہ بن گئے اور تمہیں اسلئے دگنا عذاب دیا جائیگا کہ تم بھی تو اپنے بعد میں آنیوالوں کے لئے بُری مثال قائم کر گئے۔ وہ تمہارے اسلاف تھے تو تم بعد میں آنیوالوں کے اسلاف تھے۔ یہی جواب یہ اسلاف اپنے اخلاف کو دیں گے کہ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ (۷/۳۹) تمہیں ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے جو تم ہمارے لئے دہرا عذاب اور اپنے لئے اکہرا عذاب مانگتے ہو! ہم غلط روش پر چلے تھے تو تم نے کون سا اپنی آنکھوں سے کام لے کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا؟ اسلئے تم اپنے کئے کا پھل پاؤ۔ ہمیں مطعون کرنے سے کیا حاصل ہے؟

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اپنے دلکش اور حسین انداز میں کتنی عظیم حقیقت کو واضح کر دیا ہے جو تو میں اپنی عقل و فکر سے کام لینا چھوڑ کر اسلاف کی تقلید کا مسلک اختیار کر لیتی ہیں، ان میں غلط روی کا ایک ایسا چکر (Vicious Circle) قائم ہو جاتا ہے جس سے وہ باہر نکل ہی نہیں سکتیں۔ ہر نسل اپنے پیشروؤں کے نقوش قدم پر چل کر تباہ ہوتی ہے اور اپنے نقوش قدم بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتی ہے تاکہ وہ بھی ان کی طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں گریں۔ دو چار نسلوں کے بعد یہی چیز بطور دلیل پیش کر دی جاتی ہے کہ اگر یہ روش غلط ہوتی تو ہمارے اسلاف صدیوں سے اس پر گامزن کیوں رہتے؟ اقوام سالقہ میں جب حالت یہاں تک پہنچ جاتی تھی تو خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آجاتا تھا جو انھیں اس چکر (Vicious Circle) سے نکال کر سیدھے راستے پر لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ نئے نبی کی ضرورت اسلئے ہوتی تھی کہ وہ لوگ اپنے سالقہ نبی کی کتاب کو بھی مسخ کر دیتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں رہتا تھا جس پر وہ اپنی روش کو از خود پرکھ سکتے۔ لیکن رسول اللہؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا۔ حضورؐ کی امت کے پاس ان کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہیگی۔ اس لئے انھیں اس چکر سے از خود ہی نکلنا ہوگا۔ اس کا طریقہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ ہم اندھوں کی طرح ایک دوسرے کی لکڑی پکڑ کر چلتے رہنے کی بجائے کھڑے ہو کر دیکھیں کہ ہم جس روش پر جا رہے ہیں، خدا کی کتاب اسکے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس چکر سے نکلنے کا یہی راستہ ہے۔ اگر ہم سے پہلے کسی دور میں ایسا ہو جاتا تو ہم آج اس غلط راستے پر نہ ہوتے۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو ہمارے دور میں ایسا ہو جانا چاہیئے تاکہ ہم بھی صحیح راستہ پر چل سکیں اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں بھی غلط راستے کو اپنے لئے سند نہ بنا سکیں۔ اگر ہم نے بھی ایسا نہ کیا تو ہم خود بھی موجودہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے اور آنے والی نسلوں کی غلط روی کے بھی ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ ہر دور کی غلط روی آنے والوں کے لئے سند میں اضافہ کر دیتی ہے۔ تم نے (Steel Works) کے کارخانے میں دیکھا تھا جب انجن کو شروع میں Start کرتے تھے تو اسکے لئے کافی زور لگانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کا (Fly Wheal) خود اپنے زور دوروں Momentum سے تیزی پکڑ لیتا تھا اور اس طرح اس کا ہر چکر آنے والے چکر کے لئے تقویت کا موجب بن جاتا تھا۔ یہی کیفیت قوموں کی نفسیات کی ہے۔ شروع میں غلط راستے پر چلنے کے لئے کچھ دقت ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں گذشتہ نسل کی روش آنیوالی نسل کے لئے Momentum کا

تقلید کا چکر

نجات کا راستہ

کام دیتی ہے۔ اس چکر کو ختم کرنے کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کسی دور کے مسلمان کھڑے ہو کر سوچیں کہ ہم کس راستے پر جا رہے ہیں

اگر اس کام کو کسی دور نے کرنا ہے تو وہ ہمارا ہی دَور کیوں نہ ہو؟ میں جانتا ہوں (اور خود میری زندگی کا تجربہ اس پر شاہد ہے)

سخت مخالفت

کہ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس آواز کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس طبقہ میں بیشتر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں فکر و تدبر کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی موجودہ روش کو جسے انھوں نے اسلاف کی اتباع میں اختیار کئے ہوتا ہے دیانتداری سے صحیح روش سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس روش سے ذرا سا بھی اِدھر اُدھر ہٹنا ان کے نزدیک جنت کی راہ کو چھوڑ کر جہنم کی طرف چلے جانے کے مرادف ہوتا ہے۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ یہ روش غلط ہے لیکن چونکہ اس سے ان کے مفاد وابستہ ہوتے ہیں —— اس سے عوام میں نہایت آسانی سے مقبولیت Popularity حاصل ہوتی ہے اور دوکانداری کو فروغ —— اس لئے وہ ہر اس آواز کی مخالفت کرتے ہیں جو اس راستے پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی دعوت دے۔ وہ اس مخالفت میں نہایت اوچھے حربے اختیار کرتے اور کمینے ہتھیاروں پر اتر آتے ہیں۔

لہٰذا اس آواز کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب سوال یہی ہے کہ کیا ہم مقبولیتِ عامہ کی نگاہ فریب جاذبیتوں اور مخالفت کرنے والوں کی ضرر رسانیوں کے احساس سے، اس آواز کو جیتے جی اپنے سینے میں اور مرنے کے بعد پھر مٹی میں دبا دیں یا ان تمام بدنامیوں اور نکوہشوں کے علی الرغم، آنکھیں بند کر کے چلنے والوں سے حضور رسالتمآبؐ کی اتباع میں للکار کر کہیں کہ

اِنِّیْٓ اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی۔
ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا —— (۳۴/۴۶)

میں تم سے فقط ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم خدا کے لئے دو۔ دو۔ ایک

ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ اور پھر سوچو!

اگر اس انبوہِ کثیر میں سے کچھ لوگ بھی اس آواز پر کھڑے ہو گئے تو سمجھ لو سلیم! کہ اس سے آدھا کام ہو گیا۔ اسلئے کہ جو شخص اندھا دھند چلے جانے کے بجائے کسی پکارنے والے کی آواز پر رک جائے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی روش پر نظرِ ثانی کے لئے تیار ہے (یا اُسے کم از کم اپنی موجود روش کے بارے میں کچھ تردد ضرور لاحق ہو گیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رکتا ہی کیوں) اور اسکے بعد اگر اس نے قرآن کی روشنی میں سوچنا شروع کر دیا، تو پھر کام بن گیا ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اس کے سامنے نہ آ جائے اور وہ صحیح راستہ اس کے سوا اور کونسا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے پیچھے نہ چلتا جائے بلکہ وحی کی روشنی میں خود اپنی آنکھوں سے کام لے کر خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلے۔ یہی مسلک قرآن کا بتایا ہوا ہے جس پر نبی اکرمؐ گامزن تھے۔

چہ خوش بودے اگر مردِ نکو پے ۔۔۔ زبندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب ۔۔۔ پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

والسلام؛
پرویز

اُردو زبان میں نماز

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کے بجائے) اردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر مشتمل ہے۔ لہٰذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آجاتا ہے کہ کیا قرآن، عربی زبان کے بجائے اردو زبان میں پڑھا جاسکتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر کیا قرآن کا ترجمہ (اردو یا کسی اور زبان میں۔ حتیٰ کہ خود عربی زبان کے اور الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟ اس سوال کا کھلا ہوا اور دو ٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے اور ان الفاظ کی جگہ کوئی اور الفاظ خواہ وہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے۔ لیکن اس ضمن میں بعض گوشوں سے مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال ہے کہ خدا کی طرف سے نبی اکرمؐ کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہوا تھا۔ الفاظ نہیں۔ چونکہ حضورؐ کے اولین مخاطب عرب تھے۔ اس لئے آپؐ نے اس مفہوم کو اُن لوگوں کی زبان میں بیان فرما دیا۔ لہٰذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں، وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کریں تو یہی قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصور جس کے ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جاسکتی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جاسکتا ہے۔ یعنی ــــــ نہیں۔

ایک غلط خیال

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ بحث کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبویؐ پر وحی ہوا تھا یا اس کے الفاظ بھی۔ ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ (مسئلہ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں) بڑی شدید بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن، ایک تو اُس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ دوسرے جن لوگوں نے اب اس سوال کو اٹھایا ہے وہ قدامت پرست طبقہ سے متعلق نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اِن سے اِن کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ ان کے سامنے حقیقت واضح طور پر آجائے۔

وحی کا انکار ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم خود نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات اور تصورات کا مجموعہ ہے لیکن چونکہ آپؐ نابغہ (Genius) واقع ہوئے تھے اس لئے ایک (Genius) کی طرح آپؐ (معاذاللہ) یہی سمجھتے تھے کہ ـــــ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ـــــ ان لوگوں سے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ اس قسم کا خیال وحی اور قرآن کا کھلا ہوا انکار ہے جس کے بعد کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ قرآن خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے جس میں نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا کوئی دخل نہیں۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خدا کی طرف سے القاء ہوتے تھے لیکن ان خیالات کو حضورؐ بیان اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو سردست ہمارا مخاطب ہے۔ جنہیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

الفاظ اور خیالات کا باہمی تعلق

علامہ اقبال نے "ضرب کلیم" میں "جان و تن" کے عنوان کے ماتحت کہا ہے۔

ارتباطِ حرف و معنی۔ اتحادِ جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس شعر میں انھوں نے نہایت مختصر اور مرتکز انداز سے اُس فلسفیانہ بحث کو سمو دیا ہے جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے اس سوال کو انھوں نے اپنے خطبات (خطبۂ اول) میں بھی ضمنی طور پر چھیڑا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> مبہم اور بے زبان احساس (Feeling) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیل (Idea) کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور تخیل اپنا لباس آپ بُن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ دونوں احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم کا نقص ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کرلیتا ہے۔

ڈاکٹر بک (R.M. Bucke) اپنی مشہور کتاب Cosmic Consciousness میں تصور (Concept) اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔

> ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا..... کوئی نیا لفظ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا جب تک وہ کسی تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو۔ اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ہی اسکے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ (ص ۲۷)

پروفیسر اربن (W.M. URBAN) نے اپنی کتاب Humanity and Deity میں اس موضوع پر تفصیل سے

گفتگو کی ہے کہ وجدان (Intuition) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروچ (CROCH) کے حوالے سے لکھتا ہے کہ

> الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے ..... یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شے کا تصور کرے اور اس کے بعد اُس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے۔ وہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ (صـ۲۵)
>
> اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا (صـ۲۹)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ

> جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (صـ۹۵)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (Poetry) کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ جس سے مطلب یہ ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کرکے وہ بات پیدا ہی نہیں کرسکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ کر پیدا ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق قرآن کے اس دعوے کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظہٖ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزل من اللہ کتاب ہے۔ یعنی اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

عربی زبان کی وسعت

اوّل تو عربی زبان ہی ایسی وسیع۔ گہری اور جامع ہے کہ (ماہرین علم اللسنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی (حتیٰ کہ سائنٹیفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر بک کی جس کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے (یہ بحث اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میرے لغت قرآن میں آئے گی جس سے یہ حقیقت سامنے آجائیگی کہ خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت دحکومت کے لئے منتخب کیا تھا دوسری طرف بنی اسمٰعیل کے ذمے (گویا) یہ فریضہ عائد کردیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (develop) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا، قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہوسکتے ہیں؟ بدل ہونا تو ایک طرف۔

قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا

قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہوسکتا جو اسکے پورے مفہوم کو ادا کرسکے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گب (H.A.R. GIBB) اس باب میں لکھتے ہیں۔

> جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ملہم اپنے الہام کو عام زبان میں ادا کر ہی نہیں کرسکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے بکھرے ہوتے ہیں جس طرح (کسی حسین وجمیل) تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کردیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی

ہر لکیر کے پیچ وخم اور اس کے رنگوں کے لطیف اور نازک فرق کا ایک طویل مدت تک نہایت غور وخوض سے مطالعہ کیا جائے۔ لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط والوان ہی کا نہیں۔ بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا سوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کردیتا ہے۔ اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصل صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اڑنے والے شاہین دحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی اُن تراکیب کی جگہ، جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں، ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہوسکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو۔ اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے۔ اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی دقتوں کو بھی لے آئیے (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہو!) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں، بے ہنگم سا اثر ہوگا۔ (مثلاً) قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے اِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ (۵۰/۴۳)۔ انگریزی کیا دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔

(Modern trends In Islam's P. 4)

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام! آپ سوچئے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہوسکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کرسکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں! اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن کے اپنے الفاظ، گب جیسے غیر مسلم کے دل میں اثر و جذب کا ایک محشر بپا کر دیتے ہیں لیکن

ہمارے تراجم کا اثر

جب ہم (مسلمان) اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ قٓ کی اسی آیت کو لیجئے جسے گب نے پیش کیا ہے وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے وجد میں آرہا ہے۔ اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

تحقیق ہم جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گبب نے جو ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے۔

Verily We give life and death and unto Us is the journeying

اسی قسم کے تراجم، ماڈیرک پکھتل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی نے کیے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل آیت سے گبب کے دل پر ہوا ہے؟

اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے نخلِ طیب کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیش نظر میں نے "لغات القرآن" کے بعد جب "مفہوم القرآن" کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی کسی طرح اصل کا بدل ہو سکتا ہے۔ نہ ہی اس کی حیثیت مستقل تراد پا سکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی تو یہ مفہوم بھی کافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سند دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ اس باب میں (مشہور مؤرخ) ڈاکٹر ٹوئن بی اپنی کتاب (An Historian's Approach to Religion) میں لکھتا ہے۔

> عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفۂ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں..... اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانۂ مابعد کی سائنٹفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں لہذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں زمان کی قید سے ماورا تھیں۔ (صفحہ ۱۲۶)

لہذا قرآن کا جو مفہوم بھی کسی ایک دور میں بیان کیا جائے وہ وقتی ہو سکتا ہے ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے اپنے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ قرآن کا ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ متن کا بدل نہیں ہو سکتا

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (کسی اور جگہ نہیں) قرآن کی آیات آنی چاہئیں۔ وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ وہ عربی زبان کے بھی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جا سکتے اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لئے اردو زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آجکل پڑھی جا رہی ہے اس میں لوگ (باستثنائے چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور انہیں بغیر سمجھے یونہی دہرائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے اسکی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں جن کا ہم مطلب سمجھ رہے ہوں؟

بلا سمجھے الفاظ کا دہرانا

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں وہ نماز بے مقصد اور بے روح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے روکا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴/۴۳) اے ایمان والو! تم نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب مت جاؤ جب تک تم یہ نہ جانو کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔ اس آیت میں حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے اس حکم کی علت غائی سامنے آجاتی ہے۔ یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پر نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اس کا علم نہ رکھے۔ یا جہالت کی بنا پر ایسا ہو۔ تو حکم دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے ان کے دہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔[1] یہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے تو پھر ان الفاظ کی جگہ اردو کے الفاظ کیوں نہ

سر درد کا علاج

بولیں! ایسا کہنے کے معنی یہ ہیں کہ دردِ سر کا علاج سر کاٹ ڈالنا ہے۔ سر درد کا علاج سر کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اس علت کا ازالہ ہے جو سر درد کا موجب ہے۔ یعنی اس جہالت کا دور کرنا جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معانی نہیں سمجھے جاتے۔ بنا بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ہم حکومت پر زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو۔[2]

(۲) ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔

(۳) ثانوی سے آخر تک عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔

اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آجائے گا۔

عربی۔ اردو نماز

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر ایسا نہیں کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً

(۱) اس وقت نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ مگر باجماعت نماز میں بھی فرضوں کے علاوہ باقی

---

[1] میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بے سمجھے بوجھے دہرانا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

[2] قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہوگی۔ لیکن آغازِ کار کیلئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے، تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اٹھ جائے گا۔

نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کرلیں گے کہ امام کی عربی قرأت کے ساتھ اردو کے الفاظ بولے جائیں۔ لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہوگی؟

(۲) نیز جن نمازوں میں، یا فرضوں کی جن رکعتوں میں قرأت بلند آواز سے نہیں ہوتی، ان میں اردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا؟ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ایسا ہوگا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اردو ترجمہ پکار کر کہے؟

(۳) یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک نئی شکل پیدا کرکے امت میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کردیں گے۔ یہ ایسا جرم ہوگا جو ان تمام مزعومہ فوائد کو لے ڈوبے گا جس کے پیش نظر آپ اس جدت

نئی نماز

کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رو سے فرقہ بندی مترادف شرک ہے۔ اور شرک جرم عظیم۔ ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے۔ اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے، تو خود اس فرقہ کا وجود معرض خطر میں پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے وہیں اس سے بچنے کے لئے "وحدتِ صلوٰۃ" کا ذکر کردیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔۔۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۱-۳۲) تم صلوٰۃ قائم کرو۔ اور امومن بننے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہوجاؤ۔ یعنی ان میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کردیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

میرا مسلک

یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ) اس کی شدت سے تلقین کرتا چلا آرہا ہوں کہ اس وقت جس جس طریق سے نماز پڑھی جارہی ہے اس میں کسی قسم کے رد و بدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم کے رد و بدل سے مختلف فرقوں کی نمازیں وحدت تو پیدا ہو نہیں سکے گی۔ البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہوجائے گا۔[1] وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ امت لازم و ملزوم ہیں۔ اور وحدت امت، صرف اسلامی نظام پیدا کرسکتا ہے۔ لہٰذا جب تک امت میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوجاتا، نمازمیں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، امت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے۔ اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں حضرت ہارون نے کچھ وقت کے لئے بنی اسرائیل کی

---

[1] آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس تلقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے اسلئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے!

گوسالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا (تضاد دیکھئے ۱۱)۔ لہٰذا جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نماز اردو یا اردو عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں وہ دین یا امت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے الٹا اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں تو اور کیا ہے؟

یہ ہے اس تحریک کا خطرناک پہلو۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے یعنی قوم کی جہالت دور کرنے اور اسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات۔

کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

پرویز

حکمِ قرأت بزبانِ اردو در نماز

اخبارات سے معلوم ہوا کہ اس سال لاہور میں بعض لوگوں نے عید کی نماز اس طرح ادا کی ہے کہ امام نے ایک آیت عربی میں پڑھی پھر اس کا ترجمہ اردو میں پڑھا۔ پھر دوسری اور تیسری آیت بھی اسی طرح پڑھی اور پوری قرأت اسی طریقہ سے ادا کی اور وجہ یہ بتلائی کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسکو سمجھنا چاہئے بغیر سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ! اور دلیل میں امام ابوحنیفہؒ کا قول پیش کیا کہ ان کے نزدیک فارسی وغیرہ میں قرأت جائز ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے جو ان لوگوں کے دماغ کی پیداوار ہے جو پاکستان میں کمال اتاترک کا نظریہ پھیلانا چاہتے ہیں جس نے اذان اور نماز سب ترکی زبان میں کر دی تھی اور شعائر اسلام کو رفتہ رفتہ ختم کرنا چاہا تھا۔ میں اس وقت اس تحریک کی خرابیوں اور اس کے مضرات سے بحث نہیں کرنا چاہتا اسلئے کہ مجھے یقین ہے کہ اہل پاکستان کا سنجیدہ طبقہ اس جدت کو آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ میں صرف اس گوشہ کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جس میں (اس تحریک کی تائید میں) امام ابوحنیفہ کا نام درمیان میں لایا گیا ہے یعنی یہ دلیل کہ امام ابوحنیفہؒ نے فارسی زبان میں قرأت قرآنی کو نماز میں جائز فرمایا ہے۔ سو واضح ہے کہ اول تو امام صاحب کی طرف اس قول کی نسبت ہی ضعیف ہے۔ پھر اس سے امام صاحب کا رجوع کر لینا ثابت ہے۔ توضیح تلویح، بدائع اور شامی اور بحرالرائق اور شرح ہدایہ میں تصریح ہے کہ امام صاحب نے اس قول سے رجوع فرما لیا ہے اور جس قول سے مجتہد رجوع کر لے اسکی نسبت اسکی طرف جائز نہیں جبتک اسکی تصریح نہ کر دی جائے کہ امام نے اس قول سے رجوع کر لیا ہے۔ اور اب ان کا مذہب وہی ہے جو صاحبین اور امام شافعیؒ اور جمہور امت کا ہے کہ جو شخص ایک آیت بھی عربی میں پڑھ سکتا ہو اس پر عربی میں قرأت فرض ہے اور سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ البتہ جو نو مسلم ابھی ابھی اسلام لایا ہے اور قرآن کی ایک آیت بھی عربی میں نہیں پڑھ سکتا وہ ذکر اللہ سے نماز پوری کر سکتا ہے کہ بجائے سورۂ فاتحہ اور سورت کے سبحان اللہ، سبحان اللہ یا الحمد للہ الحمد للہ کہتا رہے اور عربی میں سورۂ فاتحہ اور ایک دو سورت یاد کرنے کی کوشش کرتا رہے اور جب تک اس کوشش میں کامیاب ہو ذکر اللہ سے نماز ادا کرتا رہے اور ذکر اللہ عربی زبان کے سوا دوسری زبان سے بھی ادا ہو سکتا ہے تو ایسے نو مسلم کو اختیار ہے خواہ ذکر اللہ کو سبحان اللہ، الحمد للہ سے ادا کرے یا سورۂ فاتحہ کے ترجمہ سے اللہ کو یاد کرے کہ یہ بھی ذکر اللہ کی ایک قسم ہے۔ امام شافعیؒ اور دیگر ائمہ ایسے نو مسلم کو سورۂ فاتحہ کا ترجمہ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یا سورۂ فاتحہ عربی میں پڑھے یا عربی میں اللہ کو یاد کرے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ یا الحمد للہ الحمد للہ کہتا رہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو اعلاء السنن جلد چہارم صفحہ ۱۳۰ تا صفحہ ۱۳۹۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ نماز کے اندر فارسی وغیرہ میں دعا کرنا مکروہ تحریمی ہے اور نماز سے باہر مکروہ تنزیہی۔ جب نماز کے اندر دعا بھی بغیر عربی زبان کے جائز نہیں تو قرأت قرآن کس طرح جائز ہوگی۔ والسلام

(علامہ ظفر احمد عثمانی۔ صدر مدرس۔ دار العلوم الاسلامیہ۔ اشرف آباد۔ ٹنڈو الہ یار (سابق سندھ)

قرآن کے باطنی معانی

(چند اہم اشارات)

اللہ تعالےٰ نے وحی کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ ہم نے رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (۱۴/۴) تاکہ وہ ان کے لئے خدا کے پیغامات واضح کر دے۔

یعنی وہ اصول یہ ہے کہ خدا کی وحی اس رسول کی اولین مخاطب قوم کی زبان میں آتی ہے۔ اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اس وحی کا مطلب سمجھ لے۔ اسی کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۴۲/۷) (نیز ۴۶/۱۲)

اور اس طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اہلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو (ان کی غلط روشِ زندگی کے عواقب سے) متنبہ کر دے۔

عربوں کی زبان میں لفظ عَرَبِیٌّ کے معنی "عربوں کی زبان" بھی ہے۔ اور "واضح" بھی۔ لہٰذا قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کے معنی ہوں گے وہ قرآن جو عربی زبان میں ہے اور واضح ہے۔ دیگر مقامات میں اسے عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ کہہ کر بات کو اور بھی واضح کر دیا۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کوئی آدمی آکر سکھا جاتا ہے لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ۔ ایسا کہتے وقت یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس آدمی کی طرف یہ اشارہ کرتے ہیں (کہ وہ آکر رسول کو سکھا جاتا ہے) اس کی زبان اعجمی ہے وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ (۱۶/۱۰۳) اور یہ قرآن نہایت واضح۔ کھلی کھلی عربی زبان میں ہے۔ اَعْجَمِيٌّ کے معنی غیر عرب کی زبان بھی ہے اور غیر واضح زبان بھی۔

دوسری جگہ ہے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ۔ اگر ہم قرآن کو اعجمی زبان میں نازل کرتے (یعنی کسی غیر عرب کی زبان میں۔ یا غیر واضح زبان میں) تو یہ کہتے کہ اس کی آیات تو صاف اور واضح نہیں ہیں۔ ان سے کہو کہ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (۴۱/۴۴) یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ رسول تو عربی ہو اور اس کا پیغام اعجمی! یہ وجہ ہے کہ یہ قرآن بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶/۱۹۵) واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۲/۲ ز ۴۳) تاکہ تم لوگ اسے سمجھ سکو۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ (۲۶/۱۹۸) اگر ہم اس قرآن کو عجمیوں میں سے کسی پر نازل کرتے اور وہ اسے انھیں پڑھ کر سناتا تو یہ اس پر کبھی ایمان نہ لاتے۔

سورہ حٰم میں ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱/۳)

ایسی کتاب جس کی آیات کھلی اور نکھری ہوئی ہیں۔ یعنی عربی زبان کا قرآن۔ اس قوم کے لیے جو اس کا علم رکھتی ہے۔

قرآن کے ان مقامات سے واضح ہے کہ قرآن عربی زبان کی کتاب ہے۔ اور اس کی زبان بھی ایسی ہے جو واضح اور صاف، کھلی اور نکھری ہوئی ہے عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸) ایسی عربی زبان جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ کوئی الجھاؤ اور لپیٹ نہیں۔ یہ وہ زبان تھی جسے عرب بالعموم، اور ام القریٰ (مکہ) اور اس کے گرد و پیش کی آبادیاں بالخصوص، بغیر کسی دقت اور تکلیف کے، بلا تامل و توقف سمجھتی تھیں۔ زبان، الفاظ کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ وہ تھے جن کے معانی وہ لوگ بلا تکلف سمجھتے تھے۔ بالفاظ دیگر، قرآن کے الفاظ کے وہی معانی تھے جو معانی ان لوگوں کی زبان میں مستعمل تھے۔

یہ پوزیشن تھی قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی کی ظہور اسلام کے زمانے میں۔ اس کے بعد جب ہم تاریخ کے کچھ اوراق آگے الٹتے ہیں اور اس دور میں پہنچتے ہیں جب ایرانی۔ یہودی اور عیسائی، اپنے قدیم عقائد و تصورات کو ساتھ لے کر اسلام میں داخل ہو چکے تھے، اور اس طرح مسلمانوں میں (دیگر غیر قرآنی تصورات کی طرح) تصوف بھی عام ہو رہا تھا، اس وقت یہ عقیدہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ایک معانی تو وہ ہیں جو اس کے الفاظ سے ظاہراً طور پر متعین ہوتے ہیں لیکن دوسرے معانی وہ ہیں جو ان الفاظ کے باطن میں پنہاں ہیں۔ اور یہ باطنی معانی، قرآن کے اصلی اور حقیقی معانی ہیں۔ ہمیں اس زمانے میں یہ عقیدہ ملتا ہے اور جیسا کہ اس زمانے میں عام رواج ہو چکا تھا اس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی وضعی حدیثیں بھی ملتی ہیں کہ

ما من آیۃ الا ظھر منھا و ما بطن

ہر آیت کا ایک ظاہری مفہوم ہوتا ہے اور ایک باطنی

حالانکہ جو شخص، (قرآن تو ایک طرف) زمانۂ ظہور نبویؐ کے عربوں کے مزاج اور خصائصِ ذہنی پر نگاہ رکھتا ہے، وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ عربوں کے ہاں "باطنی تعلیم" کا تصور تک نہ تھا۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ الفاظ کے باطنی معانی بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں احادیث کے جو مجموعے ہیں، ان میں وضعی حدیثیں بھی ہیں اور صحیح بھی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان میں قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں یہ نہیں لکھا کہ فلاں لفظ کے باطنی معنی یہ ہیں۔ بہرحال، قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک بھی ایسا نہیں ملتا کہ اس کے الفاظ کے باطنی معانی بھی ہیں۔ اور جب قرآن اس قسم کا تصور نہیں دیتا تو ایسی حدیثیں جن سے اس تصور کی تائید ملتی ہے۔ لامحالہ وضعی اور جعلی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں مختصر الفاظ میں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ "باطنی معانی" کا مطلب کیا ہے۔ اور یہ تصور آیا کہاں سے ہے؟ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں جن توہم پرستیوں میں ماخوذ تھا ان میں سب سے گہری چیز سحر کا عقیدہ تھا۔ اس عقیدہ کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ علمائے عمرانیات انسانی تاریخ کے اس دور کا نام ہی عصرِ سحر (Magic Age) قرار دیتے ہیں۔ سحر کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے کہ ہر لفظ اور ہر عدد کی تہہ میں ایک باطنی معنی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اس باطنی معنی کا احاطہ کر لے تو اس سے عجیب و غریب کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جادو کے منتر (یا تعویذ) جو اب بھی مروج ہیں، ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں جو یا تو بالکل بے معنی ہوتے ہیں اور اگر ان کے الفاظ بامعنی ہوتے ہیں تو عبارت بالکل مبہم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ان منتروں میں الفاظ کے ظاہری معانی سے سروکار ہی نہیں ہوتا۔ مطلب ان کے باطنی معانی سے ہوتا ہے۔

افراد کی طرح اقوام بھی اپنے زوال کے زمانے میں اس قسم کی توہم پرستیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانے میں، یہودی قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس زمانے میں ان کا رجحان باطنی تعلیم اور سحر پرستی کی طرف ہو گیا (اگرچہ ان میں اس کے آثار اس سے پہلے بھی پائے جاتے تھے۔ لیکن اس نے شدت اسی زمانے میں اختیار کی تھی)۔ اس کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ تورات کے الفاظ کے ظاہری معنوں کے ساتھ باطنی معانی بھی ہیں۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے۔

ان باطنی معانی کے متعلق تاکید تھی کہ ان کا علم خواص تک محدود رہے۔ عوام ان پر مطلع نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ مشنا (کتاب "حقیقت") میں لکھا ہے کہ

> کتاب پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دینی چاہیئے۔ اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقامِ ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ان باطنی معانی اور حروفِ ابجد کے اعداد عجیب و غریب تاثیر کے حامل ہیں۔ ان حروف و اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے۔

> خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا اور ان کے پُراسرار مجموعے سے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

یہودیت سے یہی عقیدہ عیسائیت میں آیا۔ اُدھر ایران میں مجوسیت باطنی تعلیم کا گہوارہ تھی۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں قرآن نازل ہوا جو ان تمام توہم پرستیوں کے خلاف صدائے احتجاج تھا (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ علم و حقیقت کی دنیا میں الفاظ کے باطنی معانی کا کوئی دخل نہیں۔ قرآن علم کی بنا پر نازل ہوا ہے۔ اور اس کے معانی صاف۔ واضح۔ غیر مبہم اور بین ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں جو بسیط حقائق (Abstract Truths) آئے ہیں انھیں بھی محسوس تشبیہات میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے، اس کی بابت علم کی پختگی سے معلوم کیا جا سکتا ہے (۳/۶) یہ تھی قرآن کی تعلیم۔ لیکن جب بعد میں یہودیت۔ عیسائیت اور مجوسیت کے عقائد و مسالک چور دروازے سے اسلام میں داخل ہو گئے، تو ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ (تورات کی طرح) قرآن کے الفاظ کے بھی باطنی معانی ہیں۔ اور انہی معانی سے قرآن (بلکہ ذاتِ خداوندی) کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن جس شخص نے اسے ایک منظم فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا وہ ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابن عربی ہیں جنھیں عام طور پر شیخ اکبر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں اپنے باطنی عقائد کو بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے۔ وہی فصوص الحکم جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

اس میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبال نامہ۔ جلد ۱ صفحہ ۴۴)

شیخ اکبر کے ملفوظات اور یہودیوں کی کتاب زُھار کو آمنے سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ یہ دونوں کس حد تک ملتے جلتے ہیں۔ انھوں نے قرآن کی تفسیر اس کے الفاظ کے باطنی معانی کی رو سے کی ہے۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہے اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔

قرآن کریم میں زمین (الارض) کے متعلق ہے مِنْهَا خَلَقْنَٰكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (۲۰/۵۵)

ہم نے تمہیں اس (زمین) سے پیدا کیا ہے۔ اس میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے۔

ابن عربی وحدت الوجود کے عقیدے کے علمبردار ہیں۔ چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

ہم سب احدیت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

یہاں سوال پیدا ہو گا کہ "الارض" کا مفہوم احدیت (ذاتِ خداوندی) کس طرح لیا گیا؟ اس کے متعلق شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ

اولیاء ان کے متعلق براہِ راست رسولِ خدا سے دریافت کر لیتے ہیں۔

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ

جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل۔ صاحب الزماں۔ غوث۔ قطب لیتے ہیں۔

اسی کی تشریح میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف والہام کے ذریعے خود اللہ تعالےٰ سے لے لیتے ہیں۔

یہ ہے الفاظ قرآنی کے "باطنی معانی" کی سند! یہ ایسی سند ہے جس کا کوئی ثبوت ہی نہیں مانگ سکتا۔ اس لئے کہ ثبوت مانگنے پر جواب یہ ملیگا کہ رات ہم دربار خداوندی میں گئے تھے۔ وہاں ہم نے اللہ میاں کو خود یہ معانی بیان کرتے ہوئے سنا۔

فرمایئے! اس کے بعد آپ کیا کہیں گے؟ حتیٰ کہ جب یہ لوگ اس قسم کی تعلیم پیش کریں گے کہ

فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے کہ انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذات حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم)

تو آپ اس پر بھی معترض نہیں ہو سکیں گے۔ کیونکہ وہ کہیں گے کہ یہ قرآن کی فلاں آیت کا باطنی مفہوم ہے جسے ہم نے براہ راست تعالےٰ سے معلوم کیا ہے۔ اور یہی مفہوم حقیقی اور اصل ہے جو مفہوم الفاظ قرآنی کے ظاہری معانی کی رو سے متعین کیا جاتا ہے۔ وہ "چھوڑی ہوئی ہڈیوں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مولانا روم کا یہ مشہور شعر انہی باطنی معانی کے متعلق ہے۔

مازِ قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

آپ غور کیجئے کہ یہ قرآن کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی۔ اس سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا کسی قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف (Subtle) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ (اقبالنامہ جلد ۱ صـ۳۵)

اُس دن آج تک ہمارے ہاں یہ طریق مسلسل چلا آ رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن ہمارے ہاں عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور ہر اس عقیدہ اور تصور کا نام اسلامی تعلیم قرار پا چکا ہے جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ چونکہ اسی طریق (قرآن کے باطنی معانی متعین کرنے کے طریق) کے ایجاد یا اختیار کرنے والے اسلاف کے گرد تقدس کا نورانی ہالہ قائم ہو چکا ہے۔ اس لئے جذبات کی رو میں بہہ جانے والے اس طریق کی مدافعت کرتے اور اسے مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ (۱۳/۳۷)

اور اس طرح ہم نے اس قرآن کو عربی میں فیصلے دینے والی کتاب بنا کر بھیجا ہے۔ اگر
تو اس علم کے آجانے کے بعد ان کے جذبات کی اتباع کرے گا تو خدا کے خلاف تمہارا
کوئی کارساز اور بچانے والا نہیں ہوگا۔

قرآن کی موجودگی میں باطنی معانی کے عقیدہ اور مسلک کی تائید اور مدافعت، وہ جذبات پرستی ہے جس سے قرآن نے اس شدت سے رد کیا تھا۔

آخر میں ہم اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ قرآن عربی زبان کی واضح اور مبین کتاب ہے۔ اس کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ

(۱) پہلے یہ دیکھا جائے کہ عربی زبان میں اس کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔

(۲) پھر اس پر غور کیا جائے کہ معاملہ پیش نظر کے متعلق قرآن نے دیگر مقامات میں کیا کہا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹)

قرآن کی تشریح (اس کے معانی کو ابھار کر سامنے لانا) ہمارے ذمے ہے۔

اس کی آیات کی تفصیل خود خدا نے کی ہے۔

کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱/۱)

یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے خدا
کے ہاں سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

قرآن کی یہ تفصیل و تبیین تصریف آیات (یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے) سے کی گئی ہے۔

وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَہٗ
لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۶)

اور اس طرح ہم آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ وہ کہدیں کہ تو نے سب کچھ سنا دیا ہے
اور تاکہ ہم اہل علم کے لئے اس کی تبیین کر دیں۔

اس کے لئے کسی ایک موضوع کے متعلق قرآن کے تمام متعلقہ مقامات کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس کے بعد

(۳) اس کا اطمینان کر لیا جائے کہ جو مفہوم متعین کیا جا رہا ہے وہ قرآن کے کسی مقام کے تو خلاف نہیں۔ اس لئے کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ

لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲)

اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے

یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا طریقہ۔ اس قرآن کے سمجھنے کا جس کے متعلق خدا نے خود کہہ دیا ہے کہ یہ سمجھنے کے لئے بڑا آسان ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۵۴/۱۷) اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنا دیا ہے۔ کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے؟ اس کی یہ آسانی اس کی زبان کی آسانی ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۴۴/۵۸ ؛ ۱۹/۹۷)

ہم نے اسے تیری زبان میں آسان بنا دیا ہے تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

اس قسم کی روشن اور جگمگاتی کتاب (۲۵/۱) کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے معانی باطنی ہیں۔ کتاب کے دعاوی کو جھٹلانا ہے۔ جو کتاب بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (۳/۱۳۸) اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) ہو اس کے مطالب و معانی میں بطون کا کیا کام؟ بَيَانٌ کے تو معنی ہی ظُهُورٌ (Manifestation) کے ہیں۔ بَيَّنَ الشَّجَرُ کے معنی ہیں درختوں کے پتے باہر نکل آئے۔ بَيَّنَ الْقَرْنُ کے معنی ہیں سینگ ابھر کر باہر نکل آیا۔ ایسی کتاب کے معانی کو مخفی اور مستور سمجھنا کتاب کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

آپ ذرا اس نکتہ پر پھر غور کیجئے۔ ایک شخص قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کے معانی محاورۂ عرب کے مطابق متعین کرتا ہے اور آیت کے مفہوم کی تائید قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی لاتا ہے۔ آپ کو اس میں کوئی سقم نظر آتا ہے تو آپ اسے بتا سکتے ہیں کہ اس نے لغت میں فلاں مقام پر غلطی کھائی ہے اور اس کا پیش کردہ مفہوم قرآن کے فلاں مقام سے متصادم ہوتا ہے۔ اس طرح صحت و سقم میں بآسانی تمیز ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ایک شخص کا دعوے یہ ہو کہ اس نے اس آیت کا مفہوم، الفاظِ قرآنی کے باطنی معانی کی رو سے متعین کیا ہے تو آپ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر وہ یہ کہے کہ باطنی معانی کی رو سے، خمر سے مراد (معاذ اللہ) عمرؓ ہیں اور میسرہ سے (پناہ بخدا) ابوبکرؓ تو فرمایئے، اس کے خلاف آپ کیا کہہ سکیں گے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ اپنے پیش کردہ باطنی معانی کو صحیح قرار دیں اور دوسروں کے پیش کردہ باطنی معانی کو غلط!

آپ نے غور فرمایا کہ بات کہاں تک پہنچ رہی ہے! یاد رکھئے! خدا کی کتاب صاف اور واضح عربی زبان کی کتاب ہے، اس کے باطنی معانی کوئی نہیں۔ باطنی معانی کا عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے اور اسلام کے خلاف سازش۔ فھل من مدکر۔

"اعجاز القرآن" از:- مولانا تمنا عمادی مدظلہ

جس میں مختلف جہات سے قرآن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بڑا سائز۔ قیمت:- ایک روپیہ آٹھ آنے

سب کی پسند
مسواک
ٹوتھ برش
ٹوتھ پیسٹ
MISWAK
Tooth Paste
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

مجلسِ اقبال

چودھواں باب ـــــ الوقت سیف

(مسلسل)

زیرِ نظر باب کا پہلا حصہ سابقہ اشاعت میں سامنے آچکا ہے۔ اس میں علامہ اقبال نے زمان کے مسئلہ پر فلسفیانہ انداز سے بڑی عمیق گفتگو کی تھی۔ اس باب کا بقیہ حصہ اب پیشِ خدمت ہے۔ اس میں حضرت علامہ سب سے پہلے یہ بتلاتے ہیں کہ آزاد اور غلام میں فرق کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

نکتہ می گویمت روشن چو دُر
تا شناسی امتیازِ عبد و حُر

میں تجھے ایک راز کی بات بتاتا ہوں جو موتی سے بھی زیادہ روشن ہے اور یہ بات بتاتا اس لئے ہوں کہ تو غلام اور آزاد میں امتیاز کر سکے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ

عبد گردد یادہ در لیل و نہار
در دلِ حُر یادہ گردد روزگار

غلام وہ ہے جو روز و شب کے چکر میں پھنسا ہے۔ اور آزاد وہ ہے جس کے دل میں روز و شب سمٹ کر آجائیں۔ جس پر زماں (وقت) سوار ہو جائے وہ غلام ہے۔ اور جو زمانہ کا راکب ہو وہ آزاد ہے۔ آزاد ابن الوقت نہیں ہوتا۔ ابو الوقت ہوتا ہے۔ وہ زمانہ کی مرضی کے تابع نہیں چلتا۔ زمانہ اس کی مرضی کے تابع چلتا ہے۔ وقت اس پر حکمراں نہیں ہوتا وہ وقت پر حکمراں ہوتا ہے نہ حوادثِ دہر اس پر غالب آسکتے ہیں نہ زمانہ کی گردشیں اسے مغلوب کر سکتی ہیں۔ اس کے برعکس۔

عبد از ایام می یابد کفن
روز و شب رامی تند بر خویشتن

لیل و نہار کی گردشیں غلام کو چاروں طرف سے لپیٹ لیتی ہیں اور اس طرح زمانہ اس کا کفن بن جاتا ہے۔ غلام ایک زندہ انسان نہیں ہوتا مردہ ہوتا ہے۔ جس کا کفن روز و شب کے تانے بانے سے بُنا جاتا ہے۔ وہ حوادث کا ستایا ہوا۔ زمانے کا مارا ہوا۔ اپنی لاش

کو اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا رہتا ہے۔ لیکن۔

مردِ حُر خود را ز گِل بر می کند
خویش را بر روزگاراں می تند

بندۂ آزاد اپنے آپ کو مادہ کی بندشوں سے اوپر لے جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ روز و شب کی گردشوں کا کفن اُسے لپیٹ لے وہ روز و شب پر خود لپیٹ جاتا ہے۔ اور اس طرح ان کی گردشیں اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہیں۔

عبد چوں طائر بدامِ صبح و شام
لذتِ پرواز بر جانش حرام

غلام صبح و شام کے چکر میں اس طرح الجھ جاتا ہے، جیسے کوئی پرندہ شکاری کے جال میں پھنس جائے اور پھر لذتِ پرواز سے محروم رہ جائے۔ اس کے برعکس

سینۂ آزادۂ چابک نفس
طائرِ ایام را گردد قفس

مردِ آزاد کا سینہ جس میں خون کی حدت و حرارت اور زندگی کی تگ و تاز سے سانس کی آمد و شد برق رفتار رہتی ہے، خود طائرِ ایام کے لئے قفس بن جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ گردشِ روز و شب کے جال میں پھنس جائے وہ لیل و نہار کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتا ہے۔

عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است
واردات جانِ او بے ندرت است

غلام جدتِ فکر اور ندرتِ عمل سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ پامال اور فرسودہ راہوں پر چلنا اس کا شیوہ، اور اندھوں کی طرح دوسروں کی تقلید کئے جانا اس کا مسلک ہوتا ہے۔ وہ نہ کوئی نئی بات سوچ سکتا ہے نہ اپنے لئے کوئی نیا راستہ تراش سکتا ہے۔ چونکہ پامال راہوں پر چلنا خطروں سے خالی ہوتا ہے اس لئے اس کی عافیت کوشی اور سہل انگاری اسے کسی نئے راستے کی طرف نگہ اٹھا کر نہیں دیکھنے دیتی۔ وہ پتھر کی طرح ایک ہی مقام پر پڑا رہتا ہے اور وہیں مر جاتا ہے۔

از گرانخیزی مقامِ او ہماں
نالہ ہائے صبح و شامِ او ہماں

ایک ہی مقام پر پڑا رہتا ہے اور گردشِ فلک کے شکوے کرتا رہتا ہے۔ بایں نمط کہ ان شکووں میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔ وہی پرانی لے۔ وہی کہنہ سُر۔ اس کے برعکس۔

دمبدم نو آفرینی کارِ حُر
نغمہ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر

مردِ آزاد، ہر آن ایک نئی شان میں ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ ایک تازہ فکر، ایجاد اور ایک نادر نمونہ تخلیق کرتا ہے۔ اس کے برلبطِ فکر و عمل سے، ہر وقت تازہ بتازہ اور نو بنو نغمات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

نظرتش زحمت کشِ تکرار نیست
جادۂ او حلقۂ پرکار نیست

اوپر کہا گیا ہے کہ مردِ آزاد کی طبعِ خلاق ہر آن ایک نئی فکر کی تخلیق اور ایک نئی صلاحیت کی نمود کرتی ہے۔ اس لئے اسے یہ مسلک گوارا ہی نہیں ہوتا کہ کسی ایک چیز کو بار بار دہرایا جائے۔ وہ زندگی کی اس راہ پر چلتا ہے جو سیدھی اور بلندیوں کی طرف لے جانے والی ہے۔ وہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی دائرہ میں چکر نہیں کاٹتا رہتا۔ اس شعر میں علامہ اقبال نے ایک بہت بڑی حقیقت کو چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اسلام سے قبل فلسفہ یونان کی رو سے، زندگی ایک دائری نظام (CYCLIC ORDER) کا نام تھا جس میں ہر شے ایک گردشِ پیہم کے چکر کاٹ رہی تھی اور مقصدِ حیات اس چکر یا گردش سے نجات حاصل کرنا تھا۔ نظریۂ تناسخِ ارواح اسی تصور کا مظہر تھا۔ یہ نظریہ یونان میں پیدا ہوا۔ اور وہیں سے ہندوستان پہنچ کر آواگون کی شکل میں مذہبی عقیدہ بن گیا۔ قرآن نے اس نظریہ کی تغلیط کی اور نہایت واضح الفاظ میں بتایا کہ کاروانِ کائنات ایک صراطِ مستقیم پر چل رہا ہے جو سیدھی اور توازن بدوش بھی ہے اور بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی۔ بالفاظ دیگر، اس نے کہا کہ ہر شے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے نقطۂ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اس لئے کائنات ایک دائرے میں چکر نہیں لگا رہی۔ آگے بڑھ رہی ہے اور اوپر کو اٹھ رہی ہے۔ مردِ حُر (یعنی مردِ مومن) اس نظریہ کا حامل اور اسی مسلک کا پابند ہوتا ہے۔ نیٹشے کا ابدی تکرار (ETERNAL RECURREN CE) کا نظریہ بھی اسی آوازِ کہن کی صدائے بازگشت ہے جسے باندازِ نو پیش کیا گیا ہے۔ نیٹشے کی فکر کی اسی قسم کی بنیادی غلطیاں ہیں جن کے پیشِ نظر اقبال نے کہا ہے کہ

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

بہرحال، اقبال کا مردِ مومن تکرار و رجعت کو گوارا ہی نہیں کر سکتا۔ وہ ہر آن آگے بڑھتا اور ابھرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے

عبد را ایام زنجیر است و بس
بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس

گردشِ شب و روز، غلام کے پاؤں میں زنجیر بن کر پڑی رہتی ہے۔ وہ اسی گردش کا گرفتار اور ہمیشہ تقدیر کا شکوہ سنج اور فلک ناہنجار کی چیرہ دستیوں کا گلہ مند رہتا ہے۔ اس کے برعکس

ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر
حادثات از دستِ او صورت پذیر

مردِ حُر کی ہمت، تقدیر کی شیریں بن جاتی ہے. تقدیر جو کچھ کرتی ہے اس سے مشورہ کر کے کرتی ہے. اس کی مرضی کے خلاف کبھی کچھ نہیں کرتی۔ اور خارجی کائنات میں جس قدر حوادث رونما ہوتے ہیں، وہ اسی کے دست و بازو سے متشکل ہوتے ہیں. مردِ مومن کا "ارادہ" جب عملی پیکر اختیار کر لیتا ہے تو اسے حادثۂ روزگار کہا جاتا ہے۔

رفتہ و آئندہ در موجودِ او

دیرہا آسودہ اندر زودِ او

سابقہ اشاعت میں کہا جا چکا ہے کہ خدا کے نزدیک ماضی اور مستقبل کچھ نہیں. اس کے سامنے ایک ابدی حال (ETERNAL NOW) ہے. ماضی اور مستقبل اسی حال کے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ جب مردِ مومن کی ذات میں صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی ہیں تو وہ بھی ماضی اور مستقبل کی تفریق و تقسیم سے آزاد ہو جاتا ہے. اور گذشتہ اور آئندہ زمانے اس کے حال میں گم ہو جاتے ہیں. لیکن یہ بات ایسی نہیں جسے لفظوں میں سمجھایا جا سکے۔ اسے عقل کی رو سے سمجھا نہیں جا سکتا. یہ حیطۂ ادراک میں آ نہیں سکتی۔

آمد از صوت و صدا پاک ایں سخن　　درنمی آید بہ ادراک ایں سخن

گفتمش و حرفم ز معنی شرمسار　　شکوۂ معنی کہ با حرفم چہ کار

میں نے اس نکتہ کو الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن حالت یہ ہے کہ خود میرے یہ الفاظ، معانی سے شرمسار ہیں کہ وہ (الفاظ) ان (معانی) کے آئینہ دار نہیں ہو سکے۔ دوسری طرف، معانی شکوہ سنج ہیں کہ انھیں الفاظ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش لاحاصل کیوں کی جا رہی ہے. جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ معانی، الفاظ کے پردوں میں سما ہی نہیں سکتے؛ ان کا یہ شکوہ بجا بھی ہے. اس لئے کہ

زندہ معنی چوں بحرف آمد بمرد

از نفس ہائے تو نارِ او فسرد

زندہ معانی جب الفاظ کے پیکر میں مقید کر دیئے جائیں تو وہ زندہ رہتے ہی نہیں، مر جاتے ہیں. ان کی آتشِ پنہاں تمہارے سانس کی سردی سے بجھ جاتی ہے

اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر وقت (زمانہ) کے مسئلہ کو سمجھا کیسے جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

نکتۂ غیب و حضور اندر دل است　　رمزِ ایام و دہور اندر دل است

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت　　غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

یہ نکات درحقیقت، انسان کے دل کی گہرائیوں میں پنہاں ہوتے ہیں. وقت کے ساز کی خاموش آواز سننی ہو تو دل کی گہرائیوں میں اتر جایئے۔ وہاں جا کر اس کا مشاہدہ ہو جائے گا کہ زمان کی حقیقت کیا ہے؟

یہاں علامہ اقبال، فلسفہ سے ہٹ کر تصوف کے باطنی طریقِ حصولِ علم کی طرف آ گئے ہیں. (اور جیسا کہ ہم سابقہ اشاعت

میں لکھ چکے ہیں، تصوف کی باطنی تعلیم کی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک فن کہا جا سکتا ہے)۔

اس کے بعد علامہ اقبال، ہماری تاریخ کے اُس (اولین) دور کی طرف اشارہ کرتے ہیں جب امتِ مسلمہ نے دنیا میں حق کا رایت بلند کیا تھا۔

یاد ایامے کہ سیفِ روزگار
باتوانا دستیِ ما بود یار

اُس زمانے کو یاد کرو جب وقت کی تلوار، ہماری محکم گرفت کے ساتھ سازگار تھی۔ ہمارا ہاتھ اور وقت کی شمشیر ایک دوسرے کے رفیق و دمساز تھے۔ اس زمانے میں

تخمِ دیں در کشتِ دلہا کاشتیم
پردہ از رخسارِ حق برداشتیم

ہم نے اس زمانے میں، دین کا تخم، اقوامِ عالم کے دلوں میں بو دیا تھا۔ اور حقیقت کو اس طرح بے نقاب کر دیا تھا کہ ساری دنیا اُس کے جلوۂ عالمتاب سے بقعۂ نور بن گئی تھی۔

ناخنِ ما عقدۂ دنیا کشاد
بختِ ایں خاک از سجودِ ما کشاد

دنیا کی کوئی مشکل ایسی نہ تھی جسے ہمارے ناخنِ تدبیر نے حل نہ کر دیا ہو۔ ہمارے سجدوں سے اس زمین کے بھاگ جاگ اٹھے تھے۔

از خمِ حق بادۂ گلگوں زدیم
بر کہن مے خانہا شب خوں زدیم

ہم نے حق کی صراحی سے وہ شراب پی تھی جس نے تمام سابقہ تصورات و نظریات اور عقائد و مسالک کے شراب خانوں کو غارت کر دیا تھا۔

ماضی کے اس درخشندہ دَور کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، علامہ اقبال اس دور کی طرف آ جاتے ہیں جب مسلمان تہی دست اور نادار ہو چکا ہے اس ضمن میں وہ اہلِ مغرب سے کہتے ہیں کہ

اے مۓ دیرینہ در مینائے تو
شیشہ آب از گرمیِ صہبائے تو

ہمیں معلوم ہے کہ آج تمہاری صراحی میں بڑی تند و تیز شراب کہن ہے۔ ایسی تند و تیز کہ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جاتا ہے۔

از غرور و نخوت و کبر و منی
طعنہ بر ناداریٔ ما می زنی

تم انتہائی غرور اور تکبر سے، ہمیں ہماری ناداری پر طعنہ دیتے ہو اور اس اعتبار سے ہمیں بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ لیکن ایسا کہتے وقت تمہیں اتنا یاد رہنا چاہیئے کہ

جامِ ما ہم زیبِ محفل بودہ است
سینۂ ما صاحبِ دل بودہ است

ہم ہمیشہ سے ایسے ہی نادار اور تہی داماں نہیں تھے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب دنیا کی محفل کی زیب و زینت ہمارے ہی بادہ و جام سے تھی۔ کبھی ہمارا سینہ بھی ایک زندہ اور متحرک قلب کی آماجگاہ تھا۔

عصرِ حاضر از جلوہ ہا آراستہ
از غبارِ پائے ما برخاستہ

یہ عصرِ حاضر اپنی تمام چمک دمک اور زیب و زینت کے ساتھ، ہمارے خاکِ قدم سے پیدا ہوا ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی علم و تہذیب اور تمدن و عمرانیت کی جلوہ پاشیاں نظر آئیں گی وہ، قرآن بدست مسلمانوں ہی کی فکر و نظر کی رہینِ منت ہونگی۔

کشتِ حق سیراب گشت از خونِ ما
حق پرستانِ جہاں ممنونِ ما

ہم نے حق و صداقت کی کھیتی کو اپنے خون سے سینچا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ دنیا میں ثمر بار و گل ریز ہوئی۔ لہٰذا دنیا کے تمام حق پرستوں کو ہمارا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس کھیتی کی سیرابی اور نگہبانی نہ کرتے تو آج دنیا میں حق کا نام و نشان کہیں نہ ملتا۔

عالم از ما صاحبِ تنویر شد
از گلِ ما کعبہ ہا تعمیر شد

دنیا میں جہاں جہاں خدا کا نام بلند ہو رہا ہے، سب ہماری سعی و عمل اور تگ و تاز کا اثر ہے۔ کفرستانِ عالم میں جس قدر کعبے دکھائی دے رہے ہیں، سب ہماری مٹی سے تعمیر ہوئے ہیں

حرفِ اقرأ حق بما تعلیم کرد
رزقِ خویش از دستِ ما تقسیم کرد

اللہ نے اپنی آخری وحی کی تعلیم ہمیں ہی دی۔ ہمیں ہی اس نے اپنی کتابِ ابدی کا وارث قرار دیا۔ اور اپنے رزق کی تقسیم ہمارے ہاتھوں سے کرائی۔ ہم ہی اس کی صفتِ رب العالمینی کے مظہر تھے۔ خدا کی نعمتوں سے جسے جو کچھ ملتا تھا، ہماری وساطت سے ملتا تھا۔

گرچہ رفت از دستِ ما تاج و نگیں
ما گدایاں را بچشمِ کم مبیں

اب اگرچہ ہمارے ہاتھوں سے سلطنت نکل چکی ہے اور ہماری حکومتیں مٹ چکی ہیں، بایں ہمہ تمہیں یہ نہیں چاہیئے کہ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھو۔

در نگاہِ تو زیاں کاریم ما
کہنہ پنداریم ما خواریم ما

تمہاری نگاہوں میں ہم بالکل ناکارہ اور ناکام ہیں، ہمارے خیالات بہت پرانے ہیں۔ ہم نہایت ذلیل و خوار ہیں۔ لیکن

اعتبار از لا اِلٰہ داریم ما
ہر دو عالم را نگاہ داریم ما

اب بھی ہم دنیا میں توحید کے علمبردار ہیں۔ اسی سے ہماری عزت و توقیر ہے۔ دنیا اور عقبےٰ دونوں پر ہماری نگاہ ہے۔ ہم دونوں کے محافظ و نگراں ہیں۔

از غمِ امروز و فردا رستہ ایم
با کسے عہدِ محبت بستہ ایم

ہم نے خدا سے عہدِ محبت استوار کر رکھا ہے۔ اس کی وجہ سے ہم امروز و فردا کے غم سے آزاد ہو چکے ہیں۔

در دلِ حق سرِّ مکنونیم ما
وارثِ موسےٰ و ہارونیم ما

وہ راز جو خدا کے دل میں مستور ہے۔ ہم ہی ہیں۔ ہم انبیاء کرام کے لائے ہوئے پیغام کے وارث ہیں۔

مہر و مہ روشن زتابِ ما ہنوز
برقہا دارد سحابِ ما ہنوز

چاند اور سورج ابھی تک ہماری روشنی سے منور ہیں۔ اب بھی ہمارے برسے ہوئے بادلوں میں کئی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔

ذاتِ ما آئینہ ذاتِ حق است
ہستیٔ مسلم ز آیاتِ حق است

ہماری ذات وہ آئینہ ہے جس میں ذاتِ حق کی صفات منعکس دکھائی دے سکتی ہیں۔ ہم مسلم ہیں اور ہماری ہستی آیاتِ خداوندی سے عبارت ہے۔

علامہ اقبال کو امتِ مسلمہ سے عشق تھا۔ وہ اس ملت کے متعلق غیر کی زبان سے کوئی طعن آمیز لفظ نہیں سننا چاہتے

تھے۔ اس لئے انھوں نے اہل مغرب کی تحریفیں کے جواب میں مسلمانوں کی مدافعت میں اس جوش و محبت سے اتنے اشعار کہہ دیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان جس کتاب اللہ کے حامل ہیں، اس کی مثل و نظیر دنیا میں کہیں نہیں۔ یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی مشکلات کا حل ہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر چل کر کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ چیز ہمارے لئے باعثِ ہزار افتخار ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جو کچھ ہماری اپنی حالت ہے وہ قطعاً ایسی نہیں جس پر ہم فخر کر سکیں۔ ہم اپنی ذلت و پستی کا کوئی جواز دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ اس لئے آگے بڑھنے والی قومیں اگر ہمیں بنظرِ حقارت دیکھتی ہیں تو وہ حق بجانب ہیں۔ ان کے طعن و تعریض کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ اگر ہمارا دعوےٰ ہے کہ ہمارے پاس وہ قانونِ حیات ہے جس سے مُردوں کو زندگی مل سکتی ہے تو ہمیں خود زندہ ہو کر اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا چاہیئے۔

یہ وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبال ساری عمر پیش کرتے رہے۔

اس شعر پر زیرِ نظر باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر باب ہی کا نہیں بلکہ "اسرارِ خودی" کا بھی۔ اس کے بعد دعا ہے جسے ہم آئندہ ایک دو اشاعتوں میں سامنے لے آئیں گے۔

اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی ہے۔ قبل اس کے کہ ہم فیصلہ کریں کہ اسرارِ خودی کی طرح رموزِ بیخودی کو بھی طلوعِ اسلام میں مسلسل پیش کیا جائے، ہم قارئین کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سلسلہ مفید ہے تو ہمیں مطلع کیجئے تاکہ اس کے بعد رموزِ بیخودی کو لیا جائے۔ لیکن اگر آپ اس سلسلہ کو مفید نہیں سمجھتے تو پھر اسے اسی کتاب (اسرارِ خودی) پر ختم کر دیا جائے۔

ہمیں آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

اقبال اور قرآن

از:- پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت:- دو روپے

سلسلۂ اصلاح وتذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

۱۰

اس مضمون کی گذشتہ نو اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ۔ بھائی بہنوں کو آپس میں اور میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ اس مضمون کی موجودہ قسط میں یہ بتایا جائے گا کہ ایک مسلمان کو اپنے عام قرابت داروں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور ان کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ [طلوع اسلام]

قرابت دار

قرابت اور رشتہ داری کے تعلقات کچھ تو بہت ہی قریبی ہوتے ہیں۔ مثلاً ماں باپ اور اولاد، بھائی بہن اور میاں بیوی کے تعلقات۔ مگر قرابت داری محض ان قریبی رشتوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان تعلقات میں قربت اور یگانگت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن دوسری قرابت داریاں بھی اپنی اپنی جگہ پر کچھ کم اہم نہیں ہوتیں۔ قریبی رشتہ داریوں کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر مستقل عنوانات کے تحت ان پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اب عام رشتہ داریوں اور قرابتوں سے متعلق گفتگو کی جائے گی۔

قرابت داریاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک نسبی اور دوسری نسبتی قرابت داریاں۔ قرآن کریم نے ان کو نَسَبٌ اور صِهْرٌ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ۝ (۲۵/۵۴)

خدا ہی کی وہ ذات ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور پھر اسے نسبی اور

نسبی رشتہ داریوں میں بانٹ دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تیرا نشوونما دینے والا بڑا ہی قدرت والا ہے۔

لیکن حقوق و واجبات کے لحاظ سے قرآنی معاشرہ دونوں قسم کی رشتہ داریوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں برتتا۔ وہ ان دونوں قسم کی رشتہ داریوں کو ذِی الْقُرْبٰی (قرابت دار) کے الفاظ سے یکساں طور پر تعبیر کرتا ہے۔ قرابت دار وہ بھی ہیں جن سے ہمارا کوئی نسبی رشتہ ہو اور وہ بھی جن سے ہمارا کوئی نسبی رشتہ ہو۔

قرابت داروں کے ساتھ احسان

احسان، حُسن سے ماخوذ ہے جس کے معنے خوبصورتی کے آتے ہیں۔ احسان کے معنے ہوئے خوبصورتی پیدا کرنا۔ خوبصورتی پر اگر غور کیا جائے تو وہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ تناسب اور توازن کا نام ہے۔ لہٰذا احسان کے معنے ہوں گے توازن اور تناسب پیدا کر دینا۔ یعنی جس فرد میں جو کمی پائی جائے اسے پورا کر کے اس میں توازن پیدا کر دینا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (۲/۸۳)

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار نہیں کرو گے اور والدین، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو گے اور لوگوں سے اچھی باتیں کہو گے اور صلوٰۃ کو قائم کرو گے اور سامان نشوونما دو گے۔ مگر پھر اس عہد کے بعد تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب ہی اس سے پھر گئے اور تم تھے ہی روگردانی کرنے والے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ (۴/۳۶)

اللہ ہی کی عبودیت (اطاعت و فرماں پذیری) اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں، برابر کے رفیقوں، مسافروں، باندیوں اور غلاموں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔ یقیناً خدا ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اترانے اور اکڑنے والے ہوں۔

قرابت داروں کی مالی امداد

اگر قرابت دار ضرورتمند ہوں اور خدا نے ہمیں فارغ البالی عطا فرمائی ہو یعنی ہمارے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ مال ہو تو ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم اپنے ان قرابت داروں کی مالی امداد کریں ایسا کرنے سے خود امداد کرنے والوں کو فراخیاں اور وسعتیں اور حاصل ہوتی ہیں۔ اور ان کی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) ہو جاتی ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ
وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ
اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ (۲/۱۷۷)

اس میں کوئی فراخی اور وسعت کی بات نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف بلکہ فراخی اور وسعت اسے حاصل ہو سکتی ہے جو اللہ، یوم آخر، ملائکہ، الکتب، اور انبیاء پر ایمان لائے اور باوجود مال کی محبت کے قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، ضرورت مندوں اور غلاموں کی آزادی میں مال کو دے۔ صلوٰۃ کو قائم کرے اور سامان نشوونما بہم پہنچائے اور جب کوئی عہد کریں تو اسے پورا کریں۔ تنگی اور مصیبت اور جنگ کی حالت میں جم کر مضبوطی سے کھڑے رہیں۔ یہ لوگ ہیں جو ایمان کا دعوےٰ کرنے میں سچ بولتے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو قانون خداوندی کی نگہداشت کرنے والے ہیں۔

قرابت داروں کی امداد کوئی عطیہ نہیں ہے

قرآن کریم نے یہاں اور اسی قسم کے تمام موقعوں پر اٰتَى الْمَالَ کا لفظ استعمال کیا ہے اَعْطَى الْمَالَ کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ اعطیٰ میں عطا کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں اور آتی میں یہ بات نہیں۔ اعطیٰ کی صورت میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ قرابت داروں کی مدد کرنے سے ان پر کوئی احسان کیا جاتا ہے۔ ان کو کچھ دینا عطیہ کی کوئی شکل ہوتی ہے۔ حالانکہ قرآنی معاشرہ میں جس کو کچھ دیا جاتا ہے اس پر کوئی احسان نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اس طرح خود اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) کا سامان کیا جاتا ہے۔ کسی دوسرے کو عطیہ نہیں دیا جاتا بلکہ اس کی خدمت میں کچھ پیش کیا جاتا ہے۔ زمخشری نے کشاف میں کہا ہے کہ

اشتهر الايتاء فى معنى الاعطاء واصله الاحضار (بحوالہ تاج العروس ج ۱۰)

مشہور یہ ہے کہ اِیتَاءٌ کے معنے اِعْطَاءٌ کے ہوتے ہیں مگر دراصل اِیتَاءٌ کے معنے حاضر کر دینا اور پیش کر دینا ہوتے ہیں۔

اگرچہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ تو نہیں ہے مگر عام طور پر استعمال اسی طرح ہوتا ہے۔ لہٰذا قرابت داروں کو جو کچھ امداد کے طور پر دیا جاتا ہے وہ کوئی عطیہ یا احسان نہیں ہوتا بلکہ ایک قسم کی پیشکش ہوتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے دوسرے مقامات پر اور بھی وضاحت کے ساتھ صاف کر دیا ہے۔ جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے وہ ان کا حق ہوتا ہے جسے وہ بطور استحقاق اپنے فارغ البال افراد سے حاصل کر سکتے ہیں۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا (۱۷/۲۶)

قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کر دو اور بے موقع فضول خرچی سے کام نہ لو۔

اس مضمون کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۳۰/۳۸)

لہٰذا قرابت داروں، مسکینوں، اور مسافروں ان کا حق ادا کر دو۔ ایسا کرنا ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو خدا کی رضا کے طلب گار ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

لہٰذا قرابت داروں کی جو کچھ امداد کی جاتی ہے وہ دراصل ان کا حق ہوتا ہے جو ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی عطیہ نہیں ہوتا جس کو دے کر ان پر کوئی احسان کیا جاتا ہو۔ ہمارے ہاں اردو زبان میں عطیہ۔ تحفہ۔ ہدیہ اور نذرانہ ان چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو کوئی آدمی کسی شخص کو دیتا ہے۔ لیکن ان الفاظ کا استعمال یکساں طور پر ہر جگہ نہیں کیا جاتا۔ کوئی بڑا آدمی چھوٹے آدمی کو کچھ دیتا ہے تو اسے عطیہ کہتے ہیں۔ کوئی برابر کا آدمی برابر کے آدمی کو کچھ دیتا ہے تو اسے تحفہ یا ہدیہ کہتے ہیں۔ لیکن کوئی چھوٹا آدمی کسی بڑے آدمی کو کچھ دیتا ہے تو اسے نذرانہ کہتے ہیں۔ اس مثال کو سامنے رکھ کر ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ اَعْطٰی کا لفظ بھی عموماً عربی زبان میں ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی بڑا آدمی کسی اپنے سے چھوٹے آدمی کو کچھ دیتا ہے۔ اس میں عموماً بڑائی اور چھوٹائی۔ برتری اور کمتری کا تصور پایا جاتا ہے۔ لیکن آتٰی کا لفظ زیادہ تر ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے جہاں چھوٹائی اور بڑائی اور برتری اور کمتری کا تصور نہیں ہوتا۔ یہ لینا اور دینا کچھ برابر کا سا ہوتا ہے۔ میں کسی کو کچھ مال دیتا ہوں تو وہ مجھے میری ذات (PERSONALITY) کی نشوونما کا موقعہ بہم پہنچاتا ہے۔ اس میں میں کسی پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ میں جو کچھ کرتا ہوں خود اپنے لئے کرتا ہوں کسی دوسرے کے لئے نہیں کرتا۔ میں اگر صبح سویرے ہوا خوری کے لئے جاتا ہوں اور درختوں کے نیچے کھڑا ہو کر لمبے لمبے سانس لیتا ہوں تو کچھ درختوں پر احسان نہیں کرتا۔ میں ایسا اس لئے کرتا ہوں کہ درختوں سے آکسجن حاصل کر سکوں جو میرے لئے مدحیات ہے اگرچہ ایسا کرتے وقت میں درختوں کو بھی نائیٹروجن مہیا کر رہا ہوتا ہوں۔ لیکن میں صبح صبح اپنا آرام چھوڑ کر درختوں کو نائیٹروجن مہیا کرنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ اس لئے

درختوں پر میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے ان کو وہ گیس ضرور دیدی ہے جس کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے ان سے آکسیجن بھی حاصل کر لی ہے۔ جس کی مجھے انتہائی ضرورت تھی۔ بعینہٖ اسی طرح اگر کسی کو میں وہ چیزیں دیتا ہوں جن کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ جو میری بنیادی ضروریات سے زیادہ تھیں تو میں کسی پر کوئی احسان نہیں کرتا جبکہ میں اس سے اپنی ذات یعنی (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) کا سامان بھی ساتھ ہی ساتھ حاصل کر لیتا ہوں۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ۔ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (۱۶/۹۰)

خدا عدل و انصاف اور احسان (توازن پیدا کرنے) اور قرابت داروں کو پیش کرنے کا حکم دیتا ہے بُری ناشائستہ اور سرکشی کی باتوں سے منع کرتا ہے۔ خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اس طرح تم خدا کے قانون کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھ سکتے ہو۔

قرابت داروں کی تخصیص نہیں

قرآن دراصل اس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے کہ ہر شخص کی بنیادی ضروریات بغیر کسی دشواری اور جگر پاش مشقت کے پوری ہوتی چلی جائیں۔ اور اسے خود معاشرے کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ کسی کی کوئی بنیادی ضرورت اٹکی ہوئی نہ رہے۔ لیکن اس معاشرہ کا قیام یکبارگی اور ایک دم تو نہیں ہو سکتا اس منزل تک لامحالہ تدریجاً ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس معاشرے کی ابتداء وہ گھر یا ایک خاندان سے کرتا ہے۔ باپ کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کی پرورش اور غور و پرداخت کرے۔ پھر اس کے دائرہ کو وسیع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کا بھی خیال رکھو۔ اگر تم دیکھو کہ ان میں کوئی کمی رہی جا رہی ہے۔ اور تم میں یہ صلاحیت ہے کہ ان کی اس کمی کو پورا کر دو تو تمہیں ایسا کرنا ہی چاہیئے۔ کیونکہ بہرحال وہ بھی تو تمہارے گھر کے ہی آدمی ہیں۔ اس کے بعد وہ ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور گھر کی دیواروں کو کچھ اور پیچھے سرکاتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے پڑوسی بھی تو تم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہاری ضرورتیں ان سے اور ان کی ضرورتیں تم سے برابر پوری ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا ان کی خبر گیری کرتے رہنا بھی تمہارا فریضہ ہے۔ دیکھو اگر ان میں کوئی کمی رہ جائے تو تم ان کی اس کمی کو بھی پورا کر دو۔ پڑوسیوں کے بعد معاشرہ میں جو لوگ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں (یتامیٰ) اور جن کے چلتے ہوئے کام رک گئے ہوں۔ (مساکین) وہ بھی تو تمہارے اپنے معاشرہ ہی کا جزو ہیں۔ ان کی خبر گیری کرنا بھی تمہارا فرض ہے۔ ان کی کمیوں کو پورا کرنا اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دینا بھی ضروری ہے۔ غرضیکہ اس طرح تدریجاً وہ پورے معاشرہ کی کایا پلٹ دیتا ہے تا آنکہ وہ منزل آجاتی ہے جہاں معاشرہ تمام افراد معاشرہ کی ذمہ داریاں اٹھا لیتا ہے اور کوئی فرد کسی فرد کا محتاج نہیں رہتا۔

قرآن کریم جہاں قرابت داروں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم اپنے رشتہ داروں کو دو اور غیروں کو نہ دو بلکہ درحقیقت یہ اس معاشرے کے قیام کے لئے آغاز کار کا طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ہی سانس میں

قرابت داروں کے ساتھ ساتھ یتامیٰ، مساکین، پڑوسیوں اور مسافروں کا ذکر بھی کرتا جاتا ہے تاکہ کسی کو قرابت داروں کی تخصیص کا کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔

احسان کر کے کچھ توقعات وابستہ نہ کرو

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو خدا ان کے رشتہ داروں کی امداد و اعانت کی توفیق دیتا ہے وہ ان کی امداد تو کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ ان سے کچھ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً الیکشن میں وہ انھیں ووٹ دیں گے۔ مخالفین کے مقابلہ میں وہ ان کا ساتھ دیں گے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کی عزت و احترام کو اپنا فریضہ سمجھیں گے۔ اور جب ان کی اس قسم کی توقعات پوری نہیں ہوتیں تو انھیں سخت ناگواری ہوتی ہے اور احسان فراموشی اور نمک حرامی کے ہزار طعنے دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہی ہے کہ امداد و اعانت کی وہ حیثیت نگاہوں میں نہیں ہوتی جو قرآن نے متعین کی ہے۔ لوگ عام طور پر امداد و اعانت کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جس کی انھوں نے کچھ امداد کی ہے اسے شاید انھوں نے ساری عمر کے لئے خرید لیا ہے۔ حالانکہ قرآنی نقطۂ نظر سے امداد و اعانت کرنے والا کسی دوسرے پر کچھ بھی احسان نہیں کرتا۔ بلکہ وہ تو دراصل خود اپنی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما (DEVELOPMENT) کا سامان کرتا ہے۔ اس کے عوض میں دوسروں سے کچھ توقعات وابستہ کر لینا خود فریبی سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسے موقعوں کے لئے ہی قرآن کریم نے کہا ہے کہ

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ (۲۴/۲۲)

جن لوگوں کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ مال ہو اور گنجائش ہو وہ قرابت داروں، مسکینوں، خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو مال نہ دینے کا عہد نہ کر بیٹھیں۔ انھیں عفو و درگذر سے کام لینا چاہیئے۔ کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ خدا تمہارے لئے حفاظت و صیانت کا سامان فرمادے۔ اور خدا تو بہت ہی حفاظت کا سامان عطا فرمانے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

ترکہ میں قرابت داروں کا حصہ

قرابت داروں کے حقوق، انسانی زندگی کے ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتے۔ وہ موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی قریب ترین عزیز کچھ چھوڑ کر مرجائے تو اس کے ترکہ میں اس کے قریبی رشتہ داروں کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر متوفی نے خصوصی احوال و کوائف کے پیش نظر خود کوئی وصیت نہیں کی تو ان کا یہ حصہ قرآن کریم کی طرف سے مقرر شدہ ہوتا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَفْرُوضًا (۴/۷)

جو کچھ والدین اور نزدیک تر رشتہ دار چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا بھی حصہ ہوتا ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ وہ تھوڑا ہو یا بہت ہو۔ اس میں ان کا متعین حصہ ہوتا ہے۔

یہ احکام عبوری دور کیلئے ہیں

جیسا کہ اشارۃً پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کا قیام ہے جہاں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہیں رہتا۔ اور خدا کی یہ زمین خدا کے نظام ربوبیت کی برکتوں سے جگمگا اٹھتی ہے۔ جب یہ معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو نہ لوگوں کے پاس اپنی ضروریات سے زیادہ مال رہتا ہے اور نہ ہی ترکہ اور وصیت یا وراثت کی صورتیں باقی رہتی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس آخری منزل تک بیک جست تو نہیں پہنچا جا سکتا۔ اس منزل تک بتدریج ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ لہٰذا عبوری دور میں لوگوں کے پاس مال بھی ہوں گے اور وہ ان کے مرنے کے بعد ترکہ کی صورت میں ورثاء کے درمیان تقسیم بھی کئے جائیں گے۔ لیکن یہ نکتہ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ یہ احکام اس عبوری دور کے لئے ہیں جس میں معاشرہ ہنوز قرآن کے مثالی معاشرے تک پہنچنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہوتا ہے۔

قرابت داروں کے لئے وصیت

ہر شخص کے حالات یکساں نہیں ہوتے۔ مختلف لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کر جائے۔ اگر وہ ایسا کر جاتا ہے تو اس کا ترکہ اس کی وصیت کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ یہ وصیت وارثوں کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور غیر وارثوں کے لئے بھی بلکہ وارثوں کے لئے مقدم ہے۔ نیز اس میں ایک تہائی یا ایک چوتھائی کی کوئی قید نہیں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (۲/۱۷۶)

جب تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ اپنے بعد کچھ مال چھوڑ رہا ہو۔ تو تم پر والدین اور قرابت داروں کے لئے مناسب طور پر وصیت کر جانا لازمی ہے۔ یہ ان لوگوں پر واجب ہے جو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔

یہاں قرآن کریم نے كُتِبَ عَلَيْكُمْ (تم پر لازم کیا گیا) اور حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والوں پر واجب ہے) کے تاکیدی الفاظ کے ساتھ جس وصیت کی فرضیت بیان کی ہے وہ والدین اور نزدیک تر رشتہ داروں کے لئے ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وارثوں کے لئے کوئی وصیت ہی نہیں کی جا سکتی قرآن کی نص صریح کے خلاف ہے۔ نیز اس میں ایک تہائی وغیرہ کی کوئی قید بھی نہیں ہے۔ لہٰذا وصیت کو ایک تہائی کے ساتھ مقید کرنا قرآن کے عام حکم کو مقید کر دینا ہے جو اصولاً بھی درست نہیں۔ لیکن یہ وصیت حالات اور واقعات کے صحیح تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ بلا وجہ طرف داری اور زیادتی کے ماتحت نہیں ہونی چاہیئے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲/۱۸۲)

جسے کسی وصیت کرنے والے کے متعلق کسی قسم کی طرفداری یا بے توجہی کا اندیشہ ہو اور وہ اس کے ورثہ کے درمیان میں اصلاح کردے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ سامانِ حفاظت عطا فرمانیوالا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

لہٰذا اگر کسی وصیت کرنے والے کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ اس نے غلط قسم کی طرفداری یا نامناسب بے توجہی سے کام لیا ہے تو ایسی وصیت میں درستگی کردینی چاہیئے۔ یہ اصلاح اور درستگی ورثاء کی باہمی رضامندی سے یا قرآنی معاشرہ کی ہیئت حاکمہ کے فیصلہ کے ماتحت ہوسکتی ہے۔

طاہرہ کے نام خطوط

طاہرہ ملت اسلامیہ کی ایک نیک طینت اور ذہین بچی ہے جو ہمارے معاشرے میں عورتوں کی پریشان حالی سے بہت متاثر اور ان مشکلات کا حل معلوم کرنے کیلئے بیحد مضطرب ہے۔ اسکے مختلف استفسارات کا جواب قرآن کی روشنی میں خطوط کی صورت میں دیا گیا ہے کتاب دو حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ حصہ اول مجلد قیمت دو روپے حصہ دوم مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام

باب المراسلات

۱۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو کراچی کے قارئین میں سے ایک صاحب نے وحی اور رسالت کے سلسلہ میں متعدد نکات کی وضاحت چاہی ہے۔ انھیں سوال اور جواب کی شکل میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے استفسارات وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں آتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس مقام پر یکجا سامنے آجائیں گے اس لئے ان کی افادی حیثیت بڑھ جائے گی۔

۱۔ **سوال**۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر نبی کو وحی دی۔ لیکن ہر نبی کو کتاب نہیں ملی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی، کتاب کے ساتھ مختص نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وحی قرآن کے باہر بھی ہے۔

جواب:۔ یہ خیال یا عقیدہ کہ ہر نبی کو کتاب نہیں ملی، قرآن کریم کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ تمام انبیاء کو کتاب دی گئی تھی۔ سورۂ بقر میں ہے..... فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ. وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ..... (۲/۲۱۳) سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ خوشخبری دینے والے اور آگاہ کرنے والے۔ اور ان سب کے ساتھ (معھم) حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی وحی اور ان کی کتاب ایک ہی چیز ہے۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو راہ نمائی (ہدایت) اس وحی کے ذریعے ملتی تھی جسے وہ انبیاء کی طرف بھیجتا تھا۔ یہی ان کی کتاب کہلاتی تھی۔

چونکہ ہم اپنی اصطلاح میں کتاب اُس محسوس چیز کو کہتے ہیں جو (Book) کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہوتی ہے اس لئے ہم نے سمجھ لیا کہ نبی کی کتاب اس قسم کی کوئی چیز ہوگی جو اسے بنی بنائی آسمان سے ملتی ہوگی۔ اور جس نبی کو اس قسم کی کتاب نہیں ملتی ہوگی اسے خالی وحی ملتی ہوگی۔ یہ تصور بالکل طفلانہ ہے۔ کسی نبی کو اس کی کتاب آسمان سے بنی بنائی نہیں ملتی تھی۔ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ یہی وحی اس کی کتاب تھی۔ جب وہ وحی ایک کتابی شکل میں لکھ دی جاتی تھی تو وہ ہماری اصطلاح میں کتاب بن جاتی تھی۔ جب قرآن نبی اکرمؐ پر نازل ہوتا تھا تو وہ آپ کی وحی بھی تھا اور آپ کی کتاب بھی۔ جب اس وحی کو حضورؐ نے لکھا کر امت کو دیدیا تو وہ ہماری اصطلاح میں کتاب بن گئی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم بھی جس چیز کو کتاب اللہ کہتے ہیں، وہ گتے اور کاغذ کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ کتاب اللہ درحقیقت وہ الفاظ ہوتے ہیں جو ان کاغذوں پر لکھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک حافظ

قرآن پڑھتا ہے تو (اگرچہ اس کے سامنے کوئی کتاب نہیں ہوتی) ہم یہی کہتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کی تلاوت کر رہا ہے۔ بہرحال قرآن کی رو سے ہر نبی کی وحی اس کی کتاب ہوتی تھی اور کوئی نبی بغیر کتاب کے نہیں آتا تھا۔

اس خیال کو (کہ نبی بغیر کتاب کے آتا ہے) مرزا غلام احمد قادیانی نے بڑی شد و مد سے عام کیا۔ ان کا یہ دعوےٰ تھا کہ میں نبی ہوں، رسول نہیں ہوں۔ اور نبی اور رسول میں فرق یہ ہوتا ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی بلا کتاب کے آتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ مرزا صاحب قرآن سے کس قدر بے بہرہ تھے۔ اور اسی سے اس کا اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے آتا ہے، ان کا قرآن کے متعلق علم کس حد تک ہے!

اسی ضمن میں ایک اور دلچسپ بات سامنے آتی ہے۔ جو لوگ (قرآن سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے) یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ نبی صاحب کتاب ہوتے ہیں اور کچھ بغیر کتاب کے، وہ انبیاء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک وہ گروہ جنہیں کتاب ملی۔ دوسرا وہ جنہیں وحی تو ملی لیکن کتاب نہیں ملی۔ جس گروہ کو کتاب نہیں ملی، ان کی وحی (ان کے خیال کے مطابق) کتاب سے باہر رہی۔ لیکن جن انبیاء کو کتاب مل گئی، ان کی وحی کتاب کے اندر آ گئی۔ جیسے، رسول اللہ کو کتاب ملی لہٰذا ان کی وحی اس کتاب کے اندر آ گئی (وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ۔ ۶/۱۹)۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ (خود اپنی تقسیم کے خلاف) یہ بھی مانتے ہیں کہ جن انبیاء کو کتاب ملی، ان کی وحی کا کچھ حصہ تو کتاب کے اندر آ گیا اور کچھ حصہ کتاب کے باہر رکھا گیا! اسی سے وہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ رسول اللہ کی وحی کا ایک حصہ قرآن میں ہے اور دوسرا حصہ احادیث میں۔

ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کے متعلق مودودی صاحب نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر تمام وحی قرآن کے اندر رکھ دی جاتی تو اس سے اس کی ضخامت بہت بڑھ جاتی۔ اور ان کے ایک نائب نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اس زمانے میں سامانِ کتابت کی اتنی کمی تھی کہ قرآن کو تو کسی نہ کسی طرح (پتوں اور ہڈیوں وغیرہ پر) لکھ لیا گیا لیکن باقی وحی کے لکھنے کے لئے سامان میسر نہیں آ سکتا تھا!..... یا للعجب۔

جو لوگ ان جوابات پر تو ہنستے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وحی کا کچھ حصہ قرآن کے اندر آ گیا ہے اور باقی باہر ہے، وہ بھی اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے کہ ایسی تقسیم کیوں کی گئی اور جو حصہ قرآن سے باہر رکھا گیا تھا، اس کی حفاظت کا رسول اللہ نے کیا انتظام فرمایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس دوسرے حصہ کی حفاظت بھی بالکل اسی طرح سے ہونی چاہیئے تھی جس طرح پہلے حصہ (قرآن) کی حفاظت کی گئی تھی۔ اور وہ بھی امت کے پاس حرفاً حرفاً یقینی اور حتمی طور پر محفوظ ہونا چاہیئے تھا۔

۲۔ **سوال**:- قرآن میں رسول اللہ کے متعلق ہے وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ (۵۳/۳-۴) اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ جو کچھ اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کرتے تھے، وہ سب وحی ہوتا تھا۔ اس لئے اقوال و افعالِ رسول اللہ میں یہ فرق کرنا کہ اتنا حصہ وحی کی رو سے تھا اور باقی حصہ وحی کی رو سے نہیں تھا، قرآن کے خلاف ہے۔

جواب:- جی نہیں۔ قرآن نے خود یہ فرق کر دیا ہے۔ سورۂ سبا میں نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا

اَضِلُّ عَلٰی نَفْسِیْ۔ وَاِنِ اهْتَدَیْتُ فَبِمَا یُوْحِیْ اِلَیَّ رَبِّیْ (۳۴/۵۰) ان سے کہدو کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں[1] تو یہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (یا اس کا وبال خود میرے اوپر پڑتا ہے) اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوں تو یہ اس وحی کی بنا پر ہوتا ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔

اس حقیقت کی تشریح میں قرآن میں کئی واقعات ایسے مذکور ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کہا؟ مثلاً سورۂ توبہ میں ہے عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ..... (۹/۴۳) اللہ تجھے معاف کرے۔ تو نے انہیں کیوں اجازت دی! ظاہر ہے کہ اگر حضورؐ کا (ان لوگوں کو) اجازت دینا از روئے وحی تھا تو پھر اس پر اُسی خدا کی طرف سے جس نے وہ پہلی وحی بھیجی تھی۔ یہ تادیب کیسی؟ اس سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ (معاذ اللہ) خدا حضورؐ کو پہلے بذریعہ وحی ایک حکم دیتا تھا اور جب حضورؐ اس کی تعمیل کرتے تھے تو اس کے بعد حضورؐ سے پوچھا جاتا تھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس قسم کے کئی نظائر قرآن میں موجود ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کی رُو سے نہیں ہوتی تھی۔

اسی ضمن میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ قرآن میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اور اس کے بعد ہے کہ حضرت زیدؓ نے اس کے باوجود اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دے دی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر نبی اکرمؐ کا ہر ارشاد وحی کی بنا پر اور رسول کی حیثیت سے ہوتا تھا تو جو کچھ آپ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا تھا وہ بھی بربنائے وحی اور بحیثیتِ رسول تھا۔ اس صورت میں اس حکم نبوی کی خلاف ورزی معصیتِ رسول ہوگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی رُو سے معصیتِ رسول کیسا عظیم جرم ہے۔ تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ حضرت زیدؓ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) معصیتِ رسول کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے؟ وہ حضرت زیدؓ جن کے متعلق خود خدا کا ارشاد ہے کہ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (۳۳/۳۷) اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ حضورؐ کا یہ ارشاد نہ بربنائے وحی تھا اور نہ ہی بحیثیت رسول۔ بلکہ ایک ذاتی مشورہ تھا جسے ماننے نہ ماننے کا حق حضرت زیدؓ کو حاصل تھا۔

اس سے بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کی رو سے نہیں ہوتی تھی۔

مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو وحی کہا جاتا ہے وہ (جیسا کہ عام مفکرین کا خیال ہے) نبی کے اپنے خیالات نہیں ہوتے۔ وحی خدا کی طرف سے ملتی تھی جس میں نبی کے اپنے خیالات، جذبات اور تصورات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ آیت وحی کی ناجیت (Objectivity) یعنی اس کے منزل من اللہ ہونے کا اعلان ہے۔ اس بات کا بیان نہیں کہ نبی اکرمؐ جو بات بھی کرتے تھے وہ وحی ہوتی تھی۔

---

[1] ضَلَلْتُ کے عام معنی ہیں۔ "اگر میں گمراہ ہوتا ہوں"۔

۳۔ **سوال**:۔ سورۂ تحریم میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے ازواجِ مطہرات میں سے کسی سے کوئی بات رازدارانہ طور پر کہی۔ اس نے وہ بات کسی اور سے کہدی۔ اللہ نے آپ کو اس سے آگاہ کردیا (اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ) آپ نے اس میں سے کچھ بات اپنی اُس بیوی سے کہی اور کچھ حصہ سے اعراض برتا۔ اس پر آپ کی بیوی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کو اس کی خبر کس نے دی ہے! تو آپ نے جواب میں فرمایا نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ (۶۶/۳) مجھے علیم وخبیر نے اس کی بابت خبر دی ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کو یہ بات بذریعہ وحی بتائی تھی۔ اور یہ وحی قرآن کے اندر نہیں۔ لہٰذا حضورؐ کی طرف نازل شدہ وحی کا کچھ حصہ قرآن سے باہر بھی ہوتا تھا۔

جواب:۔ "اللہ نے آپ کو اس سے آگاہ کردیا" یا "مجھے علیم وخبیر نے اس کی بابت بتادیا ہے"۔ ان ٹکڑوں سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ چیز بذریعہ وحی ہوئی تھی قرآن کے اسلوبِ بیان سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ قرآن میں کئی مقامات ہیں جن میں اللہ نے "علم دینے" بلکہ "حکم دینے" کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن اس سے مطلب یہ نہیں کہ وہ علم یا حکم بذریعہ وحی دیا گیا تھا۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے کہ تمہارے لئے طیبات حلال ہیں وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ (۵/۴) اور جو تم شکاری کتوں کو شکار کی تعلیم دیتے ہو (انھیں سدھاتے ہو) تم انھیں سکھاتے ہو اس طریق سے جس کا علم تمہیں اللہ نے دیا ہے۔ یہاں عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ قابلِ غور ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ اللہ کی طرف سے جو علم بھی ملتا ہے وہ بذریعہ وحی ہی ملتا ہے تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ شکاری کتوں کو سدھانے والوں کی طرف بھی خدا کی وحی آتی ہے اور جو طریقہ خدا انھیں بذریعہ وحی سکھاتا ہے وہ اسی طرح کتوں کو سدھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بات غلط ہے۔ شکاری کتوں کو سدھانے والوں کو خدا کی طرف سے وحی نہیں ملتی۔

یا مثلاً قرآن میں خود انسان کے متعلق ہے عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶/۵) اللہ نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اور اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) اللہ وہ ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم دیا (تحریر کا قاعدہ سکھایا)۔ ظاہر ہے کہ انسان تحصیلِ علم بذریعہ وحی نہیں کرتا۔ نہ ہی بچہ وحی کے ذریعے لکھنا سیکھتا ہے۔

یا مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ہے وَاِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا... (۱۷/۱۶) شاہ عبدالقادرؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ "اور جب ارادہ کرتے ہیں ہم یہ کہ ہلاک کریں کسی بستی کو۔ حکم کرتے ہیں ہم دولتمندوں اس کے کو۔ پس نافرمانی کرتے ہیں بیچ اس کے...." یہاں امرنا آیا ہے۔ "ہم انھیں حکم کرتے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم وحی کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ مترفین اور فاسقین پر بھی خدا کی وحی ہوتی ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہے کہ قرآن نے جہاں یہ کہا ہے کہ اللہ نے فلاں بات کا علم دیا۔ یا اللہ نے حکم دیا۔ تو اس سے ہر مقام پر مراد علم یا حکم بذریعہ وحی ہی نہیں۔ اس سے مراد وہ فہم وفراست۔ دانش وبینش۔ سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت۔ واقعات و شواہد سے نتائج تک پہنچنے کی استعداد بھی ہے جو انسان کو اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ شکاری کتوں کو سدھانے والے،

اسی صلاحیت (استعداد) کی رُو سے انہیں سکھلتے ہیں۔ انسان اسی استعداد کی بناء پر تحصیل علم کرتا ہے۔ مترفین کی جذبات پرستیاں انہیں تباہیوں کی طرف لے جاتی ہیں اور یہ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ ان امور کی نسبت خدا کی طرف کرتا ہے جن میں متعین طور پر فاعل کا بیان کیا جانا مقصود ہو۔ بلکہ خدا کے عام قانون مشیت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو۔ (مثلاً خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ ....) یہی انداز اس نے سورہ تحریم میں اختیار کیا ہے جہاں کہا کہ اَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ۔ اللہ نے نبی کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے وہ بات واقعات و شواہد (Circumstantial Evidence) سے اپنی فہم و فراست سے معلوم کر لی ہو۔ یا آپؐ کی بیوی نے جس سے وہ بات کہدی تھی، اسی نے حضورؐ کو اس سے مطلع کر دیا ہو۔ واضح رہے کہ حضورؐ نے اپنے جواب میں نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ کہا ہے العلیم الخبیر خدا بھی ہو سکتا ہے اور وہ بھی جسے اس بات کا علم اور اس کی خبر تھی۔ بہرحال، صورت کوئی بھی ہو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضورؐ کی طرف ایسی وحی بھی ہوتی تھی جو قرآن کے اندر نہیں، بہت دور از کار بات ہے۔

لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ فرض کیجئے کہ خدا نے یہ بات حضورؐ کو وحی کے ذریعہ بتائی تھی۔ تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بات کا تعلق حضورؐ کے کسی اپنے ذاتی معاملہ سے تھا یا یہ انسانوں کی ہدایت (راہ نمائی) سے متعلق تھی؟ اگر اس کا تعلق محض حضورؐ کی ذات سے تھا اور دوسرے انسانوں کی راہ نمائی سے اس کا کچھ تعلق نہیں تھا۔ تو یہ (زیادہ سے زیادہ) اس قسم کی وحی ہوئی جیسے قرآن نے کہا ہے کہ نحل (شہد کی مکھی) کی طرف وحی ہوتی ہے۔ اور سمٰوٰت اور ارض کی طرف وحی ہوتی ہے۔ یعنی ایسی وحی جس کا تعلق انسانوں کی ہدایت سے نہیں۔ اور اگر اس کا تعلق انسانوں کی ہدایت سے تھا تو حضورؐ کا فریضہ تھا کہ اسے لوگوں تک پہنچاتے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَہٗ (۵/۶۷)۔ اے رسول! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف اتارا گیا ہے اسے (انسانوں تک) پہنچا دے اگر تو نے اسے نہ پہنچایا تو تو نے فریضہ رسالت کی ادائیگی نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ خدا کی وحی، دوسروں تک انہی الفاظ میں پہنچائی جاتی ہے جن میں وہ خدا کی طرف سے ملے۔ اب سوال یہ ہے کہ سورہ تحریم کے واقعہ سے متعلق خدا کی یہ وحی (جو قرآن میں نہیں ہے) کہاں ہے؟ جہاں تک کتب روایات کا تعلق ہے اس میں اس وحی کا بلفظہ موجود ہونا تو ایک طرف، ان سے آج تک یہ بھی متعین نہیں ہو سکا کہ یہ واقعہ کیا تھا؟ بعض روایات اسے ماریہ قبطیہ سے متعلق بتاتی ہیں۔ بعض اسے مغافیر کے شہد سے متعلق قرار دیتی ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ چیز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی خلافت سے متعلق تھی۔ شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کی خلافت سے متعلق تھی۔

بہرحال، ہم نے یہ حصہ محض اس امر کی وضاحت کے لئے لکھا ہے کہ قرآن سے باہر (مزعومہ) وحی کی پوزیشن کیا ہے ورنہ اصل چیز وہی ہے جسے ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضورؐ پر ایسی وحی ہوا کرتی تھی جو قرآن سے باہر رکھی جاتی تھی، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

یاد رکھیے: حضرات انبیائے کرام کی طرف جو وحی آتی تھی اس کا تعلق انسانوں کی ہدایت سے ہوتا تھا۔ وہ حضرات اسے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ اس وحی کو ان کی کتاب کہا جاتا تھا۔ رسول اللہ کی وحی قرآن کریم ہے۔

سوال ۴:- سورۂ بقرہ میں ہے وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ (۲/۱۴۳)، اس کے معنی یہ بتائے جاتے ہیں کہ "ہم نے (بیت المقدس کو) اس لئے قبلہ قرار دیا تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تم میں سے کون کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون پچھلے پاؤں لوٹ جاتا ہے۔" اور اس پر کہا یہ جاتا ہے کہ بتاؤ! قرآن میں کس جگہ یہ حکم آیا ہے کہ تم بیت المقدس کو قبلہ بناؤ۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی یہ وحی (کہ تم بیت المقدس کو قبلہ بناؤ) قرآن سے باہر کہیں اور ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ وحی خداوندی قرآن سے باہر بھی ہے۔

طلوع اسلام:- اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ آپ بتائیے کہ وہ کونسی حدیث ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ خدا نے بیت المقدس کو بذریعہ وحی قبلہ مقرر کیا تھا؟

اور تحقیقاتی جواب یہ ہے کہ جب تک تعین قبلہ کا حکم نہیں آیا تھا رسول اللہ بیت المقدس کی طرف رخ کیا کرتے تھے۔ آپ کا یہ عمل قرآن کے اس اصولی حکم کے مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے کہ (جب تک قرآن میں اس کے خلاف کوئی حکم نہ آجائے) حضورؐ انبیائے سابقہ کے مسلک کی اقتداء کرتے رہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۶/۹۱) اس کے بعد جب کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم آگیا تو آپ نے ادھر رخ کرلیا۔ آیت (۲/۱۴۳) کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "جس قبلہ پر تو ہے اسے ہم نے اس لئے قبلہ بنایا ہے تاکہ ....." (كُنتَ عَلَيْهَا۔ جس پر تو ہے) آیت کا اگلا ٹکڑا ان معانی کی خود تصدیق کر رہا ہے۔ اس ٹکڑے میں یہ کہا گیا ہے کہ "ہم نے اسے اس لئے قبلہ بنایا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون پچھلے پاؤں مڑ جاتا ہے۔" رسول اللہ بہت پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے جو یہود کا قبلہ تھا۔ یہودی اس سے خوش تھے اور جو لوگ یہودیوں میں سے مسلمان ہوئے تھے، وہ بھی اپنے سابقہ مسلک میں کوئی تبدیلی نہیں پاتے تھے۔ لہٰذا اس مقام پر یہ کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ہم معلوم کریں کہ کون کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون اپنے سابقہ مسلک کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد جب بیت المقدس کی جگہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا تو جن لوگوں کے دل میں بیت المقدس کی عظمت تھی ان کے لئے (اس تبدیلی میں) ایک امتحان (TEST) تھا کہ دیکھیں وہ رسول کی اتباع میں اس نئے قبلہ کو اپنا قبلہ تسلیم کرلیتے ہیں یا سابقہ قبلہ کی تعظیم ان کے دل پر غالب آجاتی ہے اور وہ اپنی سابقہ روش (یہودیت) کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ یہ ہے آیت کا صحیح مفہوم۔

سوال ۵:- سورۂ حشر میں ہے مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ ..... (۵۹/۵)۔ "تم نے جو کھجور کا درخت کاٹا، یا جسے اس کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو (تو نے) یہ سب اللہ کے اذن سے کیا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا یہ اذن کہاں ہے؟ قرآن میں نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو اذن

خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتا تھا وہ قرآن سے باہر بھی ہوتا تھا۔

طلوع اسلام :۔ جی نہیں۔ یہ اذن خداوندی قرآن میں موجود ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے اس نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن میں جو حکم اصولی طور پر دیا جاتا ہے اس کی جزئیات خود اس حکم کے تابع آجاتی ہیں۔ مندرجہ بالا آیت میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب یہودیوں کی سرکوبی کے لئے ان کے خلاف یورش کی گئی تھی اور اس میں ان کے درخت کاٹے گئے تھے قرآن میں (اصولی طور پر) یہ حکم موجود ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا..... (۲۲/۳۹) جن لوگوں پر ناحق ظلم کیا گیا ہے انھیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے (اہل کتاب کے خلاف جنگ کا حکم ۹/۲۹ میں خاص طور پر آیا ہے) یہ تھی وہ اصولی اجازت جس کے مطابق رسول اللہ نے مخالفین سے اتنی لڑائیاں لڑیں۔ چونکہ یہ سب لڑائیاں باذنِ خداوندی لڑی گئی تھیں اس لئے ان کی جزئیات تک کو بھی اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (بجز ان کے جن میں اسلامی لشکر سے کوئی غلطی ہوگئی تھی) حتیٰ کہ (سورۃ انفال میں ہے کہ) فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸/۱۷)۔ ان (مخالفین کو) تم نے قتل نہیں کیا۔ خود اللہ نے قتل کیا۔ تم نے ان کے خلاف تیر اندازی نہیں کی۔ خود اللہ نے کی۔ جس اصول کے مطابق مجاہدین کی شمشیر زنی اور تیر اندازی کے متعلق یہ کہا گیا کہ یہ کچھ تم نے نہیں کیا۔ اللہ نے کیا۔ اسی کے مطابق یہودیوں کے درخت کاٹنے کے متعلق کہا گیا کہ تم نے یہ کچھ از خود نہیں کیا۔ خدا کے اذن سے کیا ہے۔

امید ہے ان مختصر سے اشارات سے بات واضح ہوگئی ہوگی۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ وحی کا معاملہ دین کا اصل الاصول ہے۔ وحی کیا ہے اور کیا نہیں ہے اور وحی کہاں ملے گی۔ یہ وہ امور ہیں جن کے حتمی اور یقینی تعین پر دین کا دار و مدار ہے۔ ظاہر ہے کہ جس معاملہ کو دین میں اس قدر اہمیت حاصل ہو اس کی تصریح نہایت واضح۔ صاف اور غیر مبہم الفاظ میں ہونی چاہیئے۔ قرآن کی کسی آیت سے آپ کو اس کی سند نہیں مل سکتی کہ وحی قرآن کے باہر بھی کہیں ہے۔ اب قرآن کی بعض آیات سے استنباط کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ وحی قرآن سے باہر بھی ہے، یہ کہنے کے مرادف ہے کہ ایسے اہم معاملہ میں بھی اللہ تعالےٰ نے (معاذ اللہ) واضح طور پر بات نہیں کی اور اسے ہم پر چھوڑ دیا ہے کہ ہم اِدھر اُدھر سے گریدگرید کر کچھ نکالیں جس سے دین کی اس قدر اہم اور اساسی بنیاد کا ثبوت مل سکے۔ اللہ تعالےٰ کے متعلق ایسا تصور کرنا بڑی زیادتی ہے سبحان اللہ تعالےٰ عما یصفون۔ بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ (کہ وحی قرآن سے باہر بھی ہے) قرآن کا دیا ہوا نہیں۔ ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اور اب ہم اس کی تائید قرآن سے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی کے لئے ان دور از کار تاویلات اور بعید از فہم استنباطات کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ یہ قرآن کی اتباع نہیں۔ خالص جذبات پرستی ہے۔

سوال ۶:۔ قرآن کریم میں ہے کہ رسول اللہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ کتاب، قرآن کریم ہے اور حکمت حضورؐ کی احادیث ہیں۔

جواب۔ قرآن سے اس تصور کی تائید نہیں ملتی۔ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ کتاب و حکمت دونوں

الفاظ قرآن ہی کے لئے استعمال ہوئے ہیں (اس کی تفصیل ذرا بعد میں جا کر ملے گی)۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل میں ہے ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (۱۷/۳۹) ظاہر ہے کہ یہ خود قرآن کے متعلق ہے (ذالک اس پر شاہد ہے یعنی قرآن اپنی آیات کے متعلق کہتا ہے کہ یہ وہ "حکمت" ہے جسے خدا نے وحی کہا ہے)۔

اور آگے چلئے۔ قرآن اور احادیث میں فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن' وحی متلو ہے۔ (یعنی جس وحی کی تلاوت کی جاتی ہے) اور احادیث' وحی غیر متلو (جس وحی کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ سورۂ احزاب میں ازواجِ مطہراتؓ سے کہا گیا ہے کہ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۳/۳۴) اس سے ظاہر ہے کہ الحکمۃ بھی مایتلی تھی۔ یعنی اس کی تلاوت ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ حکمۃ وحیٔ غیر متلو تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم (اصولاً) دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق احکام (قوانین) سے ہے؛ اور دوسرا حصہ وہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ ان احکام کی غرض و غایت کیا ہے¹۔ ان کی علم اور حکمت کیا ہے۔ ان سے کیا کیا نتائج مرتب ہوں گے۔ یہ احکام کیوں دیئے گئے ہیں۔ اس حکمت اور غایت کو (The Why Of It) کہتے ہیں۔ ہر قانون کی کتاب میں' قانون کی غرض و غایت بیان کی جاتی ہے۔ قرآن نے احکام اور قوانین کے ساتھ ان کی غایت بھی خود ہی بیان کر دی ہے تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ ان احکام کی تعمیل قرآن کے منشا کے مطابق ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر ان احکام کے تعمیل سے وہ نتائج مرتب ہوں جو قرآن نے بیان کئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ احکام کی تعمیل قرآن کے منشا کے مطابق ہو رہی ہے۔ اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہ ہوں تو اس سے واضح ہوگا کہ احکام کی سرانجام دہی قرآن کے منشا کے مطابق نہیں ہو رہی۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت ایک ہی وحی ہے جو قرآن کے اندر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان دونوں کے لئے ضمیر واحد کی استعمال کی ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (۲/۲۳۱) اگر کتاب اور حکمت دو الگ الگ چیزیں ہوتیں تو یعظکم بہما آتا۔ لیکن چونکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں اس لئے ان کے لئے ضمیر (بہ) واحد کی آئی ہے۔

لہٰذا یعلمکم الکتاب والحکمۃ سے یہ دلیل لانا کہ حکمت سے مراد وحیٔ غیر متلو (یعنی احادیث) ہے' قرآن کی رو سے صحیح نہیں۔

سوال ۷:۔ قرآن کی ایک ہی آیت سے ایک شخص ایک نتیجہ نکالتا ہے اور دوسرا شخص اس کے خلاف ثابت

---

¹ مثلاً قرآن میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ...... تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب (حکم یا قانون) ہے اور اس کے بعد ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ یہ اس کتاب کی حکمت ہے۔

کرتا ہے۔ قرآن سے حقیقت کس طرح سمجھ میں آسکتی ہے؟

جواب۔ قرآن سے حقیقت تک پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان پہلے سے کسی عقیدہ یا خیال کو لے کر قرآن کی طرف نہ آئے۔ اس سے گمراہی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو عقائد ہمارے ہاں پہلے سے مروج چلے آرہے ہیں، لوگ ان کی تائید کے لئے قرآن میں جال ڈالتے ہیں۔ اور پھر قرآنی آیات کو اپنے عقیدہ کے مطابق ثابت کرنے کے لئے عجیب و غریب قسم کی منطقیانہ موشگافیوں سے کام لیتے ہیں۔ یعنی یہ حضرات قرآن کو اپنے عقائد کے تابع رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسی قرآن سے (مثلاً) سُنی حضرات کو (بزعم خویش) اپنے مسلک کی تائید مل جاتی ہے اور شیعہ حضرات کو اپنے مشرب کی تائید۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اگر قرآن کی آیات فی الواقعہ ایسی ہیں کہ ان سے متضاد نظریات و عقائد کو تائید مل سکتی ہے تو یہ چیز قرآن کے بنیادی دعوے کے خلاف ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔ اس لئے قرآن سے متضاد عقائد و تصورات کو کبھی تائید نہیں مل سکتی۔ متضاد نظریات کے حاملین قرآن میں کھینچا تانی کرکے، اس کی آیات کو اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن سے حقیقت تک پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان خالی الذہن ہو کر قرآن کی طرف آئے۔ اس کے دماغ میں پہلے سے ایسے عقائد جاگزیں نہ ہوں جسے یہ حق سمجھے بیٹھا ہو۔ جب انسان اس طرح اپنے ادراک کو بے رنگ کرکے قرآن سے راہ نمائی طلب کرے گا اور اس نے اپنے مطالب کی جس طرح تعریف آیات سے وضاحت کی ہے، اسی طرح اس کے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو وہ اس طالب پر حقیقت کو واشگاف کر دے گا اور اس طرح جتنی بھی کوششیں ہوں گی وہ ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گی۔ یہی قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

آپ پہلے سے اس عقیدہ کو ذہن میں نہ رکھئے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قرآن کے اندر اور دوسری قرآن سے باہر۔ اور پھر قرآن میں غور و فکر کیجئے۔ دیکھئے کہ اس طرح قرآن سے کہیں اس بات کا اشارہ تک بھی مل سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہدایت قرآن سے باہر بھی کہیں ہے؟ اگر وہ قرآن سے باہر بھی کہیں ہوتی تو خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری کو قرآن تک ہی کیوں محدود رکھتا۔ اس دوسرے حصہ کو بھی اپنی ذمہ داری کے اندر لیتا! اور پھر رسول اللہ اس حصۂ وحی کو اس طرح غیر محفوظ کیوں چھوڑ جاتے۔ لیکن یہ سب باتیں اس کی سمجھ میں آسکیں گی جبکہ اپنے ذہن میں پہلے سے اس عقیدہ کو نہ لئے بیٹھا ہو کہ وحی کی دو قسمیں تھیں۔ جو اس عقیدہ کو ایک حقیقت ثابتہ سمجھے بیٹھا ہو اس کی سمجھ میں نہ قرآن آسکتا ہے نہ علم و بصیرت پر مبنی کوئی دلیل۔ اقبال کے الفاظ میں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

پرسنل لاء دستورِ پاکستان میں لکھا ہے کہ جہاں تک پرسنل لاء کا تعلق ہے، قرآن وسنت سے مراد ان کی وہ تعبیر ہوگی جو فرقہ متعلقہ کے نزدیک قابل قبول ہو۔ لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ کیا پرسنل لاء اور غیر پرسنل لاء کی تفریق اسلام میں جائز ہے؟

طلوع اسلام:۔ پرسنل لاء اور غیر پرسنل لاء کا سوال تو بعد میں آئے گا۔ پہلے یہ پوچھئے کہ کیا مسلمانوں میں فرقوں کا وجود بھی کسی طرح سے جائز ہے؟ قرآن بنص صریح کہتا ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ (۳۰/۳۱-۳۲) (مسلمانو! دیکھنا کہیں مسلمان ہونے کے بعد تم پھر کہیں مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک فرقہ بن کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد کیفیت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک پر خوش ہے (کہ ہم سچے ہیں اور باقی سب جھوٹے ہیں۔ دوسری جگہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹) جو لوگ دین میں فرقے بنا لیں تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں۔

یہ قرآن کی تصریحات ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ ان کی موجودگی میں اسلام میں مختلف فرقوں کی کہیں گنجائش ہے! لیکن ہمارے علمائے کرام نے اسلامی دستور کا جو مسودہ حکومت کو دیا تھا۔ اور اب جس دستور کو وہ اسلامی قرار دے رہے ہیں۔ اس میں مختلف فرقوں کو قانونی حیثیت دیدی گئی ہے۔

اب پرسنل لاء کی طرف آیئے۔ آپ ہر محراب و منبر سے یہ آواز سنیں گے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست۔ دین اور دنیا میں کوئی فرق نہیں۔ اسلام انسان کی زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت قرار دیتا ہے۔ اس لئے اسے مختلف حصوں (گوشوں اور شعبوں) میں نہیں بانٹتا۔ اس قسم کی تقسیم بکسر غیر اسلامی ہے۔

لیکن یہی حضرات جب دستور پاکستان اور قانون کی طرف آتے ہیں تو شخصی قانون اور ملک کے قانون میں ایک حدِ فاصل کھینچتے ہیں اور اس تقسیم کو نہایت ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ (قرآن کو تو چھوڑیئے) کیا سنتِ رسول اللہؐ اور آثارِ صحابہؓ میں اس قسم کی تقسیم و تفریق کے متعلق کوئی اشارہ تک بھی ملتا ہے؟ یہ تفریق انگریزی عہدِ حکومت میں پیدا کی گئی تھی۔ انھوں نے ملک کے قانون کو (Secular) قرار دیا اور مختلف مذہبی گروہوں کے شخصی معاملات کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ وہ انھیں اپنے اپنے عقائد کے مطابق طے کر لیا کریں۔ ان کے نزدیک ملک کے مذہبی گروہوں کی پوزیشن بعینہٖ ایسی تھی جیسی اب پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کی ہے۔ اس وقت ہم محکوم و مجبور تھے اس لئے اس تفریق و تقسیم کے خلاف کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ انگریزوں کی غیر اسلامی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد سے مطلب ہی یہ تھا کہ ہم اس غیر اسلامی تفریق کو مٹا کر پوری کی پوری زندگی کو اسلامی قوانین کے تابع لے آئیں۔ لیکن کس قدر بدبختی ہے کہ ہم آزاد بھی ہو گئے۔ اپنی مملکت بھی قائم کر لی۔ اس میں "اسلامی دستور" بھی نافذ کر لیا۔ اور پرسنل اور غیر پرسنل لاء کی تفریق بدستور قائم رہی!

ملک کے مغرب زدہ طبقہ کو تو چھوڑیئے۔ لیکن ہمارے ہاں کے ارباب شریعت سے پوچھئے کہ اس تفریق کا کوئی جواز کتاب وسنت سے مل سکتا ہے؟ اگر نہیں مل سکتا تو پھر اس شق کے اسلامی قرار دینے کے معنی کیا ہیں؟ اقبال نے ایسے ہی مواقع کے متعلق کہا تھا کہ

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

عملِ متواتر

لاہور سے ایک دردمند مسلمان (جن کی ساری عمر ملت کی غمخواری میں گذری ہے) لکھتے ہیں۔

"آپ کوشش کرتے ہیں (اور آپ کی یہ کوشش بڑی نیک ہے اللہ آپ کو اس کی جزا دے) کہ مسلمان اپنے اختلافات اور فرقوں کو چھوڑ کر پھر سے ویسی امتِ واحدہ بن جائیں جیسی رسول اللہؐ کے زمانہ میں تھی۔ لیکن میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آسکی کہ یہ کیسے ممکن ہوگا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان اپنے ان اختلافات کو چھوڑ دیں گے جن میں سے ذرا ذرا سی بات پر وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ عقائد کو چھوڑ دیجئے۔ اعمال کو لیجئے۔ ہمیں یہ حضرات بتاتے ہیں کہ عملِ متواتر یقینی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی عملِ متواتر کے متعلق یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس لئے اس کی اتباع ہمارے لئے فرض ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے اعمالِ متواترہ میں نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اب اس نماز کو آپ دیکھئے۔ کیا کسی ایک فرقے کی نماز دوسرے فرقے سے ملتی ہے؟ اور ہر فرقہ اپنی نماز کو رسول اللہؐ کی نماز قرار دیتا ہے۔ سال بھر کی عام نمازوں کو چھوڑیئے۔ رمضان المبارک اور عید کی نمازوں کو لیجئے۔ رمضان میں ایک فریق آٹھ رکعت تراویح کو صحیح قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ بیس رکعت کو۔ اور دونوں عملِ متواتر ہیں۔ کیا یہ دونوں یقینی طور پر رسول اللہؐ کے ہیں؟ رمضان کے پورے مہینے کے اس بین اختلاف کے بعد عید کی صبح کو اٹھئے۔ آپ کو اخبارات میں ایک لمبی چوڑی فہرست اُن مسجدوں کی ملے گی (یعنی مختلف فرقوں کی مسجدوں کی) جن میں نمازِ عید ہوگی۔ اس میں پہلا فرق تو یہ نظر آئے گا کہ بعض کے نزدیک عید کی نماز مسجد میں نہیں ہو سکتی کھلے میدان میں ہو سکتی ہے۔ دوسروں کے نزدیک یہ مسجد میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد نماز کے وقت کا سوال آتا ہے۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ صبح چھ بجے سے لے کر دس بجے تک مختلف اوقات میں نمازِ عید پڑھی جائے گی۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے وقت کو عملِ متواتر بتا رہا ہے۔ آپ اب نمازِ عید میں شریک ہو جائیں۔ ایک جگہ آپ کو بارہ تکبیریں سنائی دیں گی۔ سات پہلی رکعت میں (نیت کی تکبیر کے علاوہ) اور پانچ دوسری میں۔ (رکوع والی تکبیر کے علاوہ) دوسری جگہ آپ کو چھ تکبیریں ہی دکھائی دیں گی۔ تین پہلی رکعت میں (نیت کی تکبیر اور رکوع کی تکبیر کے علاوہ) اور تین دوسری رکعت میں (رکوع کی تکبیر کے علاوہ)۔ یہ بھی ہر گروہ میں عملِ متواتر کے طور پر چلا آرہا ہے تکبیروں کے بعد قرأت کی طرف آیئے۔ ایک گروہ پہلی رکعت میں الحمد شریف سے پہلے نامذ تکبیریں کہے گا اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے۔ لیکن دوسرا گروہ دونوں رکعتوں میں قرأت سے پہلے تکبیریں کہے گا۔ یہ بھی عملِ متواتر سے چلا آرہا ہے

تعداد کے بعد انداز کی طرف آیئے۔ ایک گروہ ان تکبیروں کے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھائے گا۔ دوسرا بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیریں کہیگا اور دونوں اپنے اپنے عمل کو عملِ متواتر کہیں گے۔

فرمایئے کہ جہاں عملِ متواتر میں بھی اختلافات کی حالت یہ ہو، وہاں وحدت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور یہ اختلافات بھی صرف اہل سنت والجماعت کے دو فرقوں (حنفی اور اہل حدیث) کے ہیں۔ باقی فرقوں کے ساتھ میں نے نماز نہیں پڑھی اس لئے مجھے ان کا علم نہیں۔

آپ کی کوششوں کی خدا آپ کو جزا دے لیکن مجھے تو وحدت پیدا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ابھی ابھی عید کی نماز پڑھ کر آیا ہوں۔ اور یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی کہیں گے کہ یہ کس قسم کی عید مبارک کا خط ہے۔ لیکن جب دل سے یہی آواز نکلے تو جھوٹی خوشی کا اظہار کیسے کروں؟

طلوع اسلام:۔ یہ درست ہے کہ جب تک غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے ہمارے معیار وہی رہیں گے جو اس وقت ہیں، امت میں وحدت پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہو سکیگی لیکن معیار کے بدل دینے سے اختلافات کا مٹ جانا مشکل نہیں ہوگا۔ اور وہ معیار یہ ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اب، ہیں وہ جزئیات جن کا ذکر قرآن میں نہیں۔ تو ان میں وحدت کی شکل صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ طلوع اسلام کی یہی کوشش ہے کہ صحیح اور غلط کے متعلق ہمارا معیار قرآنی ہو جائے اور پاکستان میں اسلامی نظام علیٰ منہاج نبوت قائم ہو جائے تاکہ وہ ہمارے ان اختلافات کو مٹا کر ہمیں پھر سے امتِ واحدہ بنا دے۔ ہمیں اس نظریہ کی صحت پر کامل یقین اور اس کی کامیابی کی پوری پوری امید ہے۔ اب رہا یہ کہ اس کی کامیابی کب سامنے آئے گی، سو اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے اس کی بابت تو خود نبی اکرمؐ سے کہدیا گیا تھا کہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) تمہارے ذمے اس پیغام کو پہنچا دینا ہے۔ چلے جانا ہے۔ یہ چیز ہمارے ذمے ہے کہ اس کے نتائج کب مرتب ہو کر سامنے آئیں گے۔ لہٰذا ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

"ابنِ ابراہیم" ذیل کا خط ہمیں "ابن ابراہیم" کی طرف سے موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے نہ اپنا نام لکھا ہے نہ پتہ۔ ہم اسے درج اس لئے کر رہے ہیں کہ اس میں قرآن کے ایک بنیادی نکتہ کے متعلق بات کی گئی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس خط کو انہوں نے مختلف فرقوں کی جماعتوں کی طرف بھیجا تھا لیکن نہ کسی نے اس کا جواب دیا اور نہ ہی اپنے ہاں شائع کیا۔ خط یہ ہے۔

"قرآن کریم نے فرقہ بندی کو بنص صریح شرک قرار دیا ہے (دیکھئے سورۂ روم۔ آیت ۳۱-۳۲) اور رسول اللہ سے واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ دین میں فرقہ بنالیں تمہیں ان سے کوئی سروکار نہیں (دیکھئے سورۂ انعام۔ آیت ۱۶۰)۔

(۲) میں مختلف فرقوں کی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں۔ لیکن آج تک کسی نے ان آیات کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ میں نے ان کی تفسیریں بھی دیکھی ہیں۔ ان میں یہی لکھا ہوتا ہے کہ ہمارا فرقہ حق پر ہے اور باقی سب فرقے گمراہ ہیں۔ لیکن قرآن نے خود فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ جب فرقہ بندی ہی شرک ہے تو فرقوں میں سے کسی ایک کے حق پر ہونے اور باقیوں کے گمراہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جماعت اسلامی کے امیر جناب مودودی صاحب نے سورۂ انعام والی آیت کے متعلق حسب ذیل نوٹ لکھا ہے۔ اپنی تفسیر میں۔ (ان کی سورہ روم والی آیت کی تفسیر میں نے نہیں دیکھی) انھوں نے یہ بتانے کے بعد کہ مختلف مذہب اور فرقے کس طرح بن گئے۔ یہ کہا ہے کہ

> اب جو شخص بھی اصل دین حق کا پیرو ہو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ ان ساری گروہ بندیوں سے الگ ہو جائے اور ان سب سے اپنا راستہ جدا کرے۔

(۳) اب مختلف فرقوں سے سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جب آپ کے فرقے کے علاوہ باقی سب فرقے گمراہ ہیں۔

اور جماعت اسلامی سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب دین حق کے پیرو کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان فرقوں سے الگ ہو کر اپنا راستہ جدا کرے

> تو پھر آپ نے مختلف فرقوں کے علماء کے ساتھ مل کر ایک اسلامی دستور کا مسودہ کیسے بنایا تھا۔ اور اس مسودہ میں یہ شق کیسے رکھی تھی کہ اسلام کے تمام مسلمہ فرقوں کے حقوق محفوظ رکھے جائیں۔

کیا یہ چیز ضلالت اور گمراہی کی تائید اور شرک کی حمایت نہیں ہے؟ کیا اس قسم کے دستور کو اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے! کیا فرقوں کی موجودگی میں کسی ملک کو اسلامی کہا جا سکتا ہے؟

طلوع اسلام:۔ یہ ہے وہ خط جس کا جواب "ابن ابراہیم" صاحب مختلف فرقوں سے مانگ رہے ہیں! کس قدر بھولے ہیں یہ "ابن ابراہیم" صاحب؟

"اسباب زوال امت" دوسرا ایڈیشن

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟

قیمت:۔ دو روپے

نقد و نظر

Toynbee

پروفیسر (ڈاکٹر) آرنلڈ ٹوئن بی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف A Study Of History کے ذریعے اپنے لئے عالمگیر شہرت کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ اگرچہ اس تصنیف میں سنگر کے سے جنون انگیز شرائے نہیں ملتے لیکن ہمارے دور میں تیشۂ فرہاد کی کوہ کنی کی مثال اس سے بہتر شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر ٹوئن بی فی الواقعہ اس شہرت کا مستحق تھا جو اسے نصیب ہوئی ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ تاریخِ عالم پر ایسی (گہری تو نہیں لیکن) وسیع نگاہ نے پروفیسر صاحب کو اُس تنگ نظری سے بلند کر دیا ہوگا جو عیسائی اربابِ قلم میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ لیکن اُن کی حالیہ کتاب نے (جو اواخر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی ہے) ہمارے اس خیال کی تغلیط کر دی۔ یہ کتاب جس کا عنوان An Historian's Approach To Religion ہے۔ ان کے گفرڈ لیکچرز کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۳ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں دیئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ انھوں نے ان لیکچرز میں کہا ہے وہ کسی نہ کسی انداز میں ان کی تصنیف (تاریخ کا مطالعہ) میں آچکا ہے۔ لیکن وہاں یہ کہنے کی گنجائش رہ جاتی تھی کہ یہ مصنف کے ذاتی عقائد نہیں بلکہ اجتہادی اغلاط ہیں جو انھیں تاریخی مبہمات سے لاحق ہو گئے ہیں۔ لیکن زیرِ نظر کتاب میں اس حسن ظن کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس میں انھوں نے ان نظریات کو اپنے ذاتی عقاید کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور انھیں بعینہٖ اُسی طرح ایک حقیقتِ ثابتہ قرار دیا ہے جس طرح ایک پادری اپنے مذہب کو حق قرار دیا کرتا ہے۔ اس میں علمی تحقیق کی بجائے تعصب اور جنبہ داری کے جذبات غالب ہیں ـــــ تعصب اسلام کے خلاف اور جنبہ داری عیسائیت کی طرف۔ اس سے ہمیں افسوس ہوا کہ مغرب کے اس قدر (جینیس) بلند نظر علماء بھی جب مذہب کے میدان میں آتے ہیں تو وہاں ان میں اور ایک کٹر شنری میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اسلامی تعلیم کے متعلق پروفیسر صاحب کی معلومات کا یہ عالم ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حجرِ اسود کی پرستش اس حقیقت کی غماز ہے کہ اسلام بھی فطرت پرستی سے بلند نہیں ہو سکا (صفحہ ۲۰) پروفیسر ٹوئن بی جیسے محقق سے اتنی توقع رکھنا بیجا نہ تھی کہ وہ اس نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے (کم از کم) اتنا تو تحقیق کر لیتے کہ اسلام میں حجرِ اسود کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن میں حجرِ اسود کا نام تک نہیں آیا۔ مناسکِ حج کے سلسلہ میں اس نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ اگر پروفیسر صاحب نے کہیں سے یہ سنا یا پڑھا تھا کہ حج کے موقع پر عوام اس پتھر سے کچھ اس قسم کا علاقہ رکھتے ہیں جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں تو انھیں اس کی تحقیق کر لینی چاہیئے تھی

کہ یہ رسم عوام ہے یا قرآن کی تعلیم؟ کوئی سطحی سا مصنف اگر اس قسم کی بات لکھ دیتا تو اس پر گلہ نہ ہوتا۔ لیکن پروفیسر ٹوئن بی جیسا مورخ اگر ان چیزوں کو بطور حقائق پیش کرنے لگ جائے تو یہ امر قابلِ تاسف ہے۔

(۲) ڈاکٹر ٹوئن بی کے دل میں جو بات کانٹا بن کر چبھ رہی ہے وہ قرآن کا یہ دعوے ہے کہ میری تعلیم بے مثل و بے نظیر ہے اور نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر نبوت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس لئے اسلام خدا کا آخری اور مکمل دین ہے۔ اگرچہ وہ اس باب میں اسلام کا نام خصوصیت سے نہیں لیتے اور اس دعوے کو تمام بلند مذاہب بالخصوص وہ جن کا سرچشمہ ابراہیمی (ان کے الفاظ میں اسرائیلی) تعلیم ہے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن ارباب علم سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ "مکملیت۔ خاتمیت اور ہمہ گیریت" کا دعوے کھلے اور واضح الفاظ میں قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس لئے پروفیسر صاحب کے نشتر کی نوک اسی کی رگِ جاں پر ہے وہ اس تصور سے کس بُری طرح تلملا رہے ہیں اس کا اندازہ ان کی کتاب کے دسویں باب کے ایک ایک پیراگراف سے لگ سکتا ہے۔ پہلے وہ رمز و ایما کے پردے میں بات کرتے ہیں لیکن جب اس سے ان کا اطمینان نہیں ہوتا تو بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ کسی شخص کا یہ کہنا کہ

> خدا نے وحی و رسالت کے لئے مجھے چن لیا ہے اور جو پیغام مجھے دیا ہے وہ بے مثل و بے نظیر ہے اور اس پر وحی کا خاتمہ ہو گیا ہے (ص ۱۳۲)

کس قدر تعجب انگیز ہے؟ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ

> بلند مذاہب کا یہ دعوے کہ ہمارا دین بے مثل و بے نظیر ہے اور اس پر وحی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ایک مؤرخ کی نگاہ میں بڑا ہی غیر مقدس اعلان ہے۔ یہ دعوے اس انانیت کا مظہر ہے جو آدم کے "گناہِ اول" کی شکل میں ہمارے سامنے آئی تھی (ص ۱۳۲)

(۳) یہ ہے پروفیسر ٹوئن بی کا اسلام کے خلاف تعصب۔ اس کے برعکس، عیسائیت کی جنبہ داری کا یہ عالم ہے کہ ان کے نزدیک

> خدا محبت ہے۔ ایسی محبت جس کے لئے اس نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ اس نے انسان کو خود اپنی عملی مثال سے اس کی تعلیم دی ہے کہ دکھ اور تکلیف کو آگے بڑھ کر سینے سے لگا لینا چاہیئے۔
>
> اگر حق یہی ہے اور اسی حق کی وحی، بلند مذاہب کی انجیل ہے تو ہمیں اس گراں قدر اور بیش بہا روحانی متاع کو کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ (ص ۱۴۰)

یہ خالص عیسائیت کی تعلیم ہے۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کی مدح و ستائش کے گیت گائے۔ اس کی محبت میں جذب ہو کر اس سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کرے اور اپنی ذات کو کالعدم فنا کر کے، حقیقتِ

مطلق سے ہم آہنگ ہوجائے (ص ۲۶۷ تا ص ۲۷۳) یہاں عیسائیت کا تصوف آجاتا ہے۔ جو مغربی ارباب فکر کی آخری پناہ گاہ ہے۔

یہ ہیں ڈاکٹر ٹوئن بی کے مذہب کے متعلق خیالات جن کا دنیا نے اس لئے آگے بڑھ کر استقبال کیا کہ یہ ایک وسیع النظر، بالغ فکر، تاریخ عالم کے محقق کے عمر بھر کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ اور جو در حقیقت ایک عیسائی مشنری کی تبلیغ سے زیادہ کچھ نہیں۔

البتہ ان مقامات سے ہٹ کر ڈاکٹر ٹوئن بی نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو ان کے علم و تحقیق کے شایان شان ہے۔ اگرچہ اکثر مقامات پر اس میں منطقی اسقام بھی پائے جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ڈاکٹر ٹوئن بی تاریخ کے اسکالر ہیں، مفکر نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی اپنے میدان سے نکل کر فلسفہ (بالخصوص فلسفہ مذہب) کے احاطہ میں قدم رکھتے ہیں لغزش کھا جاتے ہیں۔ وہ اگر اپنے ہی دائرے میں رہیں تو ان کے لئے زیادہ اچھا ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت: خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔
ناظم ادارہ طلوع اسلام

تفسیر
بیان القرآن

یہ تفسیر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی نادر تالیف ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان کی موجودہ تفاسیر میں اس کی کوئی نظیر نہیں تو قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ حقیقتاً یہ تفسیر اور ترجمہ قرآن پاک ہر مسلمان کے پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ (نمونے کے صفحے مفت منگوا کر ملاحظہ فرمایئے)

تاج کمپنی لمیٹڈ پوسٹ بکس ۵۳۰ کراچی

TYPEWRITER RIBBONS
GEM CLIPS
PAPER FASTENERS
STAPLES
THUMB TACKS
PINS
پورے پاکستان میں
عام اسٹیشنری صرف یہی فیکٹری تیار کر رہی ہے
اسکی مصنوعات آپ کا اپنا قومی سرمایہ ہے
MADE IN PAKISTAN
GENERAL STATIONERS LTD.
SITE MANGHOPIR ROAD, KARACHI
اب غیرملکی عام اشیائے اسٹیشنری کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے
کیونکہ ہم نے مال کے بنانے میں اسی خوشنمائی، پائیداری اور معیار کو ملحوظ رکھا ہے جو انگلینڈ، جرمن اور امریکہ وغیرہ پیش نظر رکھتے ہیں۔ قومی ترقی کا انحصار ملک کی مصنوعات کی استعمال کرنے پر ہے۔
جنرل منیجر- جنرل اسٹیشنرز لمیٹیڈ (مینوفیکچررز)

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

ان کتابوں سے پیدا ہو سکے گا

معراج انسانیت حضور صلعم کی ذات اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی اسے قرآنی آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد قیمت :۔ بیس روپے۔

ابلیس و آدم سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات۔ ملائکہ۔ وحی۔ شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کیلئے سلسلۂ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے۔

جوئے نور کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا؟ زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات : قیمت دس روپے۔

سلیم کے نام خطوط مذہب کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب۔ بڑے سائز کے ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نظامِ ربوبیت نوع انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقل انسانی نے کیا سوچا؟ اور قرآن نے اس کا حل کیا بتایا ہے۔ دور حاضر کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۴۰۰ صفحات قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

اسباب زوالِ امت (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ ضخامت ۴۷۲ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز کے تدبر قرآن کا نتیجہ ہیں)

ملنے کا پتہ :۔ **ناظم ادارۂ طلوع اسلام** ۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

رابطہ باہمی

مرکزی بزم طلوع اسلام کراچی

عیدالفطر نزول قرآن کریم کا جشن مسرت ہے۔ اس لئے اس تقریب سعید پر قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا امکان بھرا ہتمام کیا گیا۔ چنانچہ شہر کی تمام عید گاہوں میں قرآنی لٹریچر حسن انتظام اور سنجیدگی سے تقسیم کیا گیا کہ کسی سمت سے مخالفت کی کوئی آواز نہ اٹھی۔ اللہ کا احسان ہے کہ قرآن کی آواز فضا میں زیادہ سے زیادہ پھیلتی جا رہی ہے جس سے مخالفین کی بہتان تراشیوں کا پردہ خود بخود چاک ہوتا جا رہا ہے۔

(۲) اسی تقریب کے سلسلہ میں محترم پرویز صاحب کے مکان پر قرآنی احباب کا اجتماع ہفتہ کی شام کو ہوا۔ ان احباب کی وجہ جامعیت ہی قرآن تھا۔ اور اجتماع میں چرچا بھی قرآن ہی کا رہا۔ خورد و نوش کا انتظام سادہ لیکن بڑا خوشگوار تھا۔ محترم پرویز صاحب کے پیغام عید نے قلوب میں صحیح عمل و کردار کے لئے ایک ولولہ پیدا کر دیا۔

(۳) اخبارات سے اطلاع موصول ہوئی کہ لاہور میں اردو عربی کی ایک مرکب قسم کی نماز عید پڑھی گئی۔ کیونکہ یہ چیز قرآن کی تعلیم کے خلاف تھی اور ملت میں ایک نیا انتشار پیدا کرنے کا موجب تھی اس لئے بزم کی طرف سے تمام شہر میں بڑے بڑے پوسٹر چسپاں کئے گئے جس میں بتایا گیا کہ نماز عربی زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتی اور کسی فرد کو اس کا حق نہیں کہ ہماری مروجہ نماز میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کر سکے۔

(۴) بزم کے زیر اہتمام عربی کلاس اپنی سابقہ رفتار کے ساتھ جاری ہے اور اس سائنٹیفک طریق سے عربی سیکھنے سے فی الواقعہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنے مختصر عرصہ میں طالب علموں کو عربی زبان کے بنیادی اصولوں پر اس قدر عبور ہو گیا ہے۔

بزم طلوع اسلام راولپنڈی

کے ترجمان لکھتے ہیں کہ یہاں کے اراکین اصلاح خویش پر زیادہ سے زیادہ زور دے رہے ہیں۔ اور کوشش کر رہے ہیں کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی قرآن کے مطابق گذرے۔ پابندیٔ صلوٰۃ اور دیگر ارکان اسلام پر زیادہ عمل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بزم طلوع اسلام۔ گجرانوالہ

کے ترجمان رقمطراز ہیں کہ یہاں قرآنی مطبوعات مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ نیز ترجمان صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی بزم کا کوئی بھی رکن کبھی یہاں تشریف لائے تو ان سے ضرور ملے۔

بزم طلوع اسلام۔ حیدرآباد

محترم خورشید علی خاں صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے بزم کا قیام عمل میں آیا۔

جناب نادار خاں صاحب وکیل کو ترجمان منتخب کیا گیا اور محمد عثمان علی خاں مولوی کامل۔ منشی فاضل کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ قرب وجوار میں رہنے والے قرآنی احباب سے درخواست کی جاتی ہے کہ بزم ہذا سے اپنا رابطہ قائم کریں۔

بزم طلوع اسلام کوئٹہ

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ ہر اتوار کو دفتر طلوع اسلام شارع جناح پر باقاعدگی سے اجتماع ہوتا ہے جس میں قرآن کے پیش نظر دورِ حاضر کے مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ بلوچستان اور قلات کے قرآنی احباب سے درخواست کی جاتی ہے کہ جناب محمد محسن صاحب ترجمان ہذا سے اپنا رابطہ قائم کریں۔

بزم طلوع اسلام مظفر گڈھ

کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ نیشنل نیوز ایجنسی بک اسٹال۔ نزد صدر ڈاک خانہ مظفر گڈھ پر قرآنی مطبوعات کی فروخت کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ قرب وجوار کے رہنے والے اس انتظام سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ قرآنی فکر کے حامل اور ہم مسلک طلوع اسلام حضرات کی آگاہی کے لئے مشتہر کیا جاتا ہے کہ بزم ہذا کے دارالمطالعہ میں طلوع اسلام کی پرانی فائلیں اور تمام کتب موجود ہیں۔ ضرورت مند حضرات مفت مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بزم طلوع اسلام۔ لائلپور

کے سکریٹری اطلاع دیتے ہیں کہ یہاں احباب کا اجتماع ہوا۔ جس میں بزم کی تشکیل پر غور کیا گیا اور ہر رکن نے عہد کیا کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ قرآن کو سمجھنے کی دوسروں کو سمجھانے کی اور اس کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کی ہر امکانی کوشش کروں گا۔

بزم طلوع اسلام لاڑکانہ

کے سکریٹری اطلاع دیتے ہیں کہ اراکین بزم ہذا نے باتفاق یہ طے کیا کہ ہر رکن بزم بطیب خاطر قرآن کی اشاعت کے لئے کچھ نہ کچھ خرچ کرے۔ اراکین بزم ہذا باقاعدگی سے اپنا تبلیغی کام کر رہے ہیں۔

بزم طلوع اسلام منڈی دیو ناگجرات

کے سکریٹری اطلاع دیتے ہیں کہ اراکین بزم ہذا کا جلسہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ بزم کا ایک دفتر کھولا جائے تاکہ باقاعدگی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور خدمت خلق کی جا سکے۔

بزم طلوع اسلام مردان

کے سکریٹری اطلاع دیتے ہیں کہ درس قرآن ہر روز ساڑھے آٹھ بجے سے ساڑھے نو بجے شام کو باقاعدگی سے ہوتا ہے۔ اس وقت گیارہویں پارے کا درس ہو رہا ہے۔

۲۔ دارالمطالعہ دو مہینے سے جاری ہے۔ جس میں چار پانچ روزانہ اخبارات۔ دو تین ماہوار رسالے۔ تمام قرآنی مطبوعات مطالعہ کے لئے موجود رہتی ہیں۔

۳۔ قرآنی مطبوعات باقاعدگی سے تقسیم کی جاتی ہیں۔

تاکید ۱۔ بزم ہائے طلوع اسلام لاہور۔ راولپنڈی۔ ملتان۔ جام پور۔ کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خاں

کو تاکید کی جاتی ہے کہ آپ اپنی ماہوار رپورٹ باقاعدگی سے ہر ماہ کی دس تاریخ تک مرکزی دفتر کو بھیجا کریں۔

۲۔ تمام بزم ہائے طلوع اسلام کے اراکین سے درخواست کی جاتی ہے کہ آپ قرآن کی تعلیم کو پیش نظر رکھیں اور اپنے کردار و عمل سے ثابت کردیں کہ واقعی آپ کو قرآن سے نسبت ہے۔ نیز شر پر اور امن و امان میں رخنہ ڈالنے والے عناصر سے نہ الجھیں اپنا تبلیغی کام خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے کیا کریں۔ مزید ہدایات اور مشورہ کے لئے بوقت ضرورت مرکزی بزم سے رابطہ رکھیں۔

سکریٹری مرکزی بزم طلوعِ اسلام
۱۲۵۔ خلیق منزل۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی نمبر ۳

"برق طور" از:۔ پرویز

بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی بصیرت افروز اور عبرت انگیز داستان۔ بڑا سائز ۳۲۰ صفحات قیمت چھ روپے

اِس قیمت پر آپ کو ٹریٹ سے اچھا بلیڈ نہیں مل سکتا
اور پھر ٹریٹ کا شیو کم خرچ ہی نہیں بلکہ
آرام دہ، اور پُر لطف بھی ہے۔

۵ آنے میں ۵
۱۰ آنے میں ۱۰

زیادہ قیمت ہرگز ادا نہ کیجئے

چند بصیرت افروز کتابیں

جشن نامے ہم ہر سال جشنِ جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا۔ جیسے ہم نو سال سے مناتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم فشاں اور دردانگیز تصویر۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

مزاج شناسِ رسولؐ پیشوایانہ ڈکٹیٹریت کی راہیں کس طرح ہموار کی جارہی ہیں اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیئے تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث (ہر دو جلد مکمل) حدیث سے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ حدیث کی تاریخ۔ منکرینِ حدیث کون ہیں۔ غرضیکہ احادیث کے متعلق اتنی وسیع معلومات آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔ ہر جلد تقریباً ۴۰۰ صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے۔ مکمل آٹھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق پر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے۔

نوادرات از:- علامہ اسلم جیراجپوریؒ
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از:- پرویز
مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآن کے ارشادات۔ بالخصوص بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔ ۱۹۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- **ناظم ادارۂ طلوع اسلام** ۳/۱۵۹ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

اِنسان نے کیا سوچا؟

از:- پرویز

زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟۔ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۹ × ۲۲/۸ ضخامت ۳۶۸ صفحات قیمت دس روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

آپ کا پسندیدہ

تبت ٹوتھ پیسٹ

کلوروفل کے ساتھ یا سادہ۔ جیسا آپ چاہیں

تبت

ٹوتھ پیسٹ

دانتوں کی جلا اور بقاء کے لئے تبت ٹوتھ پیسٹ بہترین ثابت ہوا ہے۔ بہت سے قدر دانوں کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اب ایک علیحدہ ٹوتھ پیسٹ کلوروفل شامل کر کے تیار کیا گیا ہے۔ کلوروفل منہ کو جراثیم سے پاک کر کے مہک پیدا کرنے اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لئے ایک مفید اور اہم جز ہے۔

آپ اپنے حسب پسند تبت ٹوتھ پیسٹ سادہ یا کلوروفل کے ساتھ ہر جگہ سے خرید سکتے ہیں۔

ہم دنیا کا اعلیٰ ترین کلوروفل استعمال کرتے ہیں

کوہ نور کیمیکل کمپنی۔ کراچی، ڈھاکہ

UNITED

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش

دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے

چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک

نایاب تحفہ ہے

جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور

جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ ہے